ہفت روزہ
الفتح
کراچی

دُنیا کی مظلوم اقوام، اقوامِ متحدہ سے

خوں بہا مانگتی ہیں

صفحہ ۷ پر

۲۳ — ۳۰ ستمبر ۱۹۷۱ء



قیمت — ۵۰ پیسے
ہوائی — ۷۵



دھوئیں بھرے ہیں دِلوں میں دماغ جلتے ہیں
چمن کے جِسم پہ گُل بن کے داغ جلتے ہیں

کِس اہتمام سے کھویا ہے قافلہ دِل کا
بُجھی بُجھی سی ہیں راہیں سُراغ جلتے ہیں

کوئی سبب کوئی اِس کا علاج بھی ہوگا
کہ ہم بہار بساتے ہیں باغ جلتے ہیں

نہ بُجھ سکا دلِ سوزاں جو آندھیوں میں آج
اِس اِک چراغ سے کیا کیا چراغ جلتے ہیں



جمیل الدین عالی

عوام ـــ عوام ـــ عوام

ملک ایک شدید بحران سے گزر رہا ہے۔ یہ جملہ اس قدر استعمال ہوا ہے کہ اس کا مفہوم ختم ہو گیا ہے۔ جس ملک میں اکثر اوقات بحران ہی رہے۔ وہاں کے عوام کے لئے بحران میں کوئی خاص اہمیت اور نزاکت نہیں رہتی، اور بحرانی حالات بھی معمول کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ لیکن ہم گذشتہ چند ماہ سے جس بحران کا شکار ہیں۔ وہ اس قدر پہلو رکھتا ہے کہ اس نے ہر زاویے سے ہم پر حملہ کر رکھا ہے۔ یہ ماننے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم اقتصادی، سفارتی، سیاسی، تجارتی، تعلیمی، زرعی ہر محاذ پر کمزور پڑ گئے ہیں۔ اقتصادی طور پر ہمیں جن حالات کا سامنا ہیں۔ وہ واقعتاً انتہائی تشویشناک ہیں۔ عام آدمی اقتصادیات کی پیچیدگیوں سے اگرچہ پوری طرح آگاہ نہیں ہے۔ لیکن کمزور معیشت کا حملہ اس پر بھی براہ راست ہوتا ہے۔ اسے روز مرّہ کی زندگی میں اس افتاد کا تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ اعداد و شمار بھی بتاتے ہیں، قرائن بھی کہہ رہے ہیں، ہمارے بازار اور اسٹاک ایکسچینج بتاتے ہیں کہ ہم اقتصادی طور پر کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں اسٹیٹ بنک کے سالانہ اجلاس میں اسٹیٹ بنک کے گورنر نے جو تقریر کی، وہ ہماری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی سے زیادہ ہے (اسکا جائزہ الگ بھی لیا جا رہا ہے) اس کے علاوہ کرنسی واپس لینا، زرمبادلہ کا علاقہ تبدیل کرنا، بھی اقتصادیات کو سنبھالا دینے کی کوششیں ہیں۔

یہ سب تبدیلیاں اور سرگرمیاں ـــ بوجھ صرف ایک طبقے پر ڈال رہی ہیں۔ وہ ہیں غریب مفلوک الحال عوام۔ مشرقی پاکستان کے ہوں یا مغربی پاکستان ـــ سرمایہ داروں نے اس اقتصادی بحران میں بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے طریقے ڈھونڈ لئے ہیں، ان کے کارخانے چلیں، بند ہیں یا آہستہ چلیں ـــ یہ اپنے منافع کی شرح برقرار رکھنے کا نسخہ ڈھونڈ لیتے ہیں، غریب عوام ہر تبدیلی کے بعد اپنی پریشانیوں میں مزید دھنس جاتے ہیں۔

موجودہ بحران میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اس بحران کے حل میں عوام کی شراکت کا کوئی طریقہ نہیں ڈھونڈا جا رہا ، وہ اس بحران کی براہ راست زد میں تو ہیں، ان کے بھائی بے روزگار ہو رہے ہیں۔ دواؤں کے بغیر دم توڑ رہے ہیں۔ لیکن تقدیر کا جبر ہے کہ وہ خاموش تماشائی بن کر یہ سب کچھ دیکھتے رہیں، وہ اس بحران کے حل میں شرکت کے لئے اپنے آپ کو پیش کر سکتے ہیں۔ نہ اس بحران پر احتجاج کر سکتے ہیں۔

ملک عوام کا ہے۔

اکثریت عوام کی ہے۔

حق عوام کا ہے۔

نقصان عوام کا ہے۔

مگر وہ کر کچھ نہیں سکتے۔ ان کی طاقت صلاحیت ضائع جا رہی ہے۔ وہ خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ کیونکہ ان کا ملک اقتصادی تباہی کے کنارے پر ہے۔ وہ کچھ نہیں کر سکتے، کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے، وہ آواز بلند نہیں کر سکتے ـــ یہ کیسا دور ہے ؟ یہ کیسا کرب ہے۔ ؟۔ ان کے ذہن پریشان ہیں، دل گریاں ہیں، آنکھیں حیران ـــ ان کے دل و دماغ سلگ رہے ہیں۔ اپنے وطن کو آگ کے شعلوں سے بچانے کے لئے ان کے ہاتھ، ان کی طاقت، ان کے ذہن ـــ کام نہیں آ رہے۔ یہ کیسا اندھیر ہے۔ ؟



خُدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد: ـــ ۲ شمارہ: ـــ ۱۹

۲۳-۳۰ ستمبر ۱۹۷۱ء

نگران

شوکت صدّیقی

محمود شام

مدیر

ارشاد راؤ

معاونین خصوصی

ابراہیم جلیس، افضل صدیقی عبدالحمید چھاپرا

مجلسِ ادارت

وہاب صدّیقی ۔ نعیم آروی

آرٹ ایڈیٹر

غلام نبی بزمی

عکاس :ـــ الطاف رانا

بدلِ اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۷۵ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت :- ۶۰ فلس دوبئی، قطر: ۷۵ درہم

سعودی عرب :- ۱۵ قرش۔ انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقام اشاعت

ہفت روزہ الفتح ۴۸ ڈی، نرسری کمرشل ایریا بی، ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس کراچی-۲۹

ایڈیٹر پبلشر، ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد۔کراچی

موجودہ نظام نے پاکستان کو اقتصادی طور پر تباہ کر دیا ہے

سٹیٹ بنک کے گورنر کی تقریر — تلخ حقائق کا اعتراف

الفتح کے اقتصادی مبصر کے قلم سے

ملک کے سنجیدہ اور محب وطن حلقوں میں سٹیٹ بنک کے سالانہ اجلاس میں سٹیٹ بنک کے نئے گورنر جناب ایس یو درانی کی تقریر نے انتہائی تشویش پھیلا دی ہے اس میں تلخ حقائق کا اعتراف کیا گیا ہے اس سے سنجیدہ حلقوں کو یہ حیرت ہوئی ہے کہ بیوروکریسی کے ایک اہم شوق نے ان تلخ حقائق کو برملا کیسے بیان کر دیا ہے ساقی نے شراب میں کچھ ملا نہ دیا ہو۔ وجہ کچھ بھی ہو ہمیں یہ خوشی ہے کہ حقائق اور اعداد و شمار سامنے آگئے ہیں، اور اب اپنے ملک کی معیشت کا اندازہ کرنا آسان ہو گیا ہے۔ پہلے ان کی تقریر کے اہم نکات ملاحظہ کر لیں۔ پھر ان کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ مسائل میں اضافے کا سبب غذائی پیداوار میں خود کفالت کے حصول میں ناکامی غیر ضروری اشیائے صرف بنانے والی اور درآمدی خام مال پر انحصار کرنے والی صنعتوں کا غیر ضروری تحفظ اور سرمائے کا غیر ضروری پھیلاؤ ہے۔

۲۔ سماجی انصاف موجودہ زندگی کا ایک اہم حصہ ہے بڑھتی ہوئی اقتصادی عدم مساوات اور سماجی کشیدگی کی فضا میں ترقی کی رفتار برقرار نہیں رکھی جا سکتی۔

۳۔ اس بار خسارے کی مالیات ۱۱ کروڑ روپے بجٹ جواب تک سب سے زیادہ ہے۔ خسارے کی مالیات حکومت وسائل کا حقیقی خلا چھپانے کے لئے کرتی ہے

۴ اب وقت آگیا ہے کہ ہمیں غیر حقیقت پسندانہ روش چھوڑ دینی چاہیئے، اور اپنے وسائل کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر سالانہ ترقیاتی منصوبے بنانے چاہئیں

۵۔ افراطِ زر کی بجائے ٹیکسوں کی وصولی پر زور دیا جائے، پاکستان میں ٹیکسوں کا موجودہ نظام انتہائی غیر لچکدار ہے، ایسے اقدامات کئے جانے چاہئیں، جن سے ٹیکسوں میں لچک پیدا ہو، براہ راست ٹیکس کے تمام ذرائع سے فائدہ اٹھایا جائے۔

۶۔ ان صنعتوں کو ترجیح دی جائے، جن میں زیادہ سے زیادہ مزدور کام کر سکیں اور جن کے لئے کم سے کم سرمایہ اور زرمبادلہ درکار ہو۔ غیر ضروری اشیائے صرف کی صنعتیں غیر ضروری خرچ کی حوصلہ افزائی اور بچت کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں،

۷۔ برآمدی بونس اسکیم کی وجہ سے شرح مبادلہ میں عدم استحکام پیدا ہوا ہے اور مصنوعات کی کوالٹی بہترین بنانے پر توجہ کم ہو گئی ہے بونس اسکیم کی وجہ سے کاروبار اور سرمایہ کاری کے فیصلوں میں غیر یقینی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

۸۔ تقسیم دولت کا مسئلہ سنگین ہو گیا ہے۔ جس کا اظہار اور اقتصادی عدم توازن اور بے چینی کے ذریعے ہو رہا ہے۔

۹۔ سماجی انصاف موجودہ زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ بڑھتی ہوئی اقتصادی عدم مساوات اور سماجی کشیدگی کی فضا میں ترقی کی رفتار برقرار نہیں رکھی جا سکتی۔

۱۰۔ کرنسی نوٹوں کی تنسیخ کے بعد سوا اکیاسی کروڑ کے نوٹ گردش میں نہیں رہے۔ لیکن ان نوٹوں کے ختم ہو جانے سے مجموعی طور پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ یہ نوٹ پہلے بھی گردش میں نہیں تھے

ان تلخ حقائق کے اظہار سے پاکستان کی مالیاتی حالت پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے اور اندازہ ہو جاتا ہے کہ اقتصادی طور پر ہم بالکل کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ اس کا اعتراف سٹیٹ بنک کے گورنر کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس کے اسباب انتخابات سے پہلے مشرقی پاکستان میں سیلاب، پھر مشرقی پاکستان میں سیاسی ہنگامے، اس کے بعد پھر مشرقی پاکستان میں سیلاب مغربی پاکستان میں مزدوروں میں بے چینی بتائے ہیں ان واقعات سے جہاں پیداوار میں کمی ہوئی ہے۔ وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان واقعات سے نمٹنے کے لئے جو احتسابی، انتظامی اور فوجی کارروائی کرنا پڑی اس سے اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ اخراجات کا مقابلہ پیداوار بڑھا کر کیا جا سکتا ہے، لیکن ہمارے ہاں اس کے بجائے خسارے کی مالیات تیار کی جاتی ہے، جس کا نتیجہ ہوشربا مہنگائی کی صورت میں نکلتا ہے۔ کیونکہ درانی صاحب نے خود اعتراف کیا ہے کہ ٹیکس دہندگان ٹیکس ادا نہیں کرتے۔

درانی صاحب نے منصوبہ بندیوں پر بھی اعتراض کیا ہے۔ اور بالکل درست اعتراض ہے۔ ہمارے منصوبہ بندی کے ماہرین نے کبھی ملک کے مسائل اور وسائل کو پیش نظر نہیں رکھا۔ یہ ماہرین جان بوجھ کر غیر ممالک کی محتاجی جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اپنے ملک کی سب سے بڑی دولت یعنی افرادی طاقت کے استعمال کے منصوبے نہیں بنائے جاتے، جس کی وجہ سے بے روزگاری میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اور درآمدات پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت ہمارے صنعتی علاقوں میں ۵۰ فی صد سے زیادہ مزدور بے کار ہیں یہی حال دیہاتی علاقوں میں ہے منصوبہ بندی کا تمام تر محور شہروں کے صنعتی علاقے ہیں اسی فی صد آبادی دیہات میں زراعت سے وابستہ ہے۔ زراعت کی طرف توجہ نہیں دی جاتی، اس لئے ہم غذائی معاملوں میں خود کفیل نہیں ہونے پاتے اور ہمیں اناج کے لئے بھی دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں یہ انتہائی بے غیرتی ہے۔ اس بحران کے بعد تو خاص طور پر افراد کے دست و بازو کی طاقت بروئے کار لانے کے منصوبے بنائے جانے چاہیئں تھے۔ مغربی پاکستان اور بالخصوص مشرقی پاکستان میں زیادہ سے زیادہ افراد کو ترقیاتی کاموں میں مصروف کیا جاتا تو قوم میں مایوسی بھی نہ پھیلتی اور پیداوار میں کمی بھی نہ ہوتی۔ مگر ہمارے منصوبہ بندی کرنے والے مہدی موعود کے انتظار میں رہتے ہیں۔ چوتھا پنجسالہ منصوبہ

باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیں

یہ ہفتہ

اہم اعلانات کا ہفتہ ہے

محمود شام

یہ ہفتہ اہم اعلانات کا ہفتہ ہے۔

اُدھر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس ہو رہا ہے، اِدھر پاکستان میں اہم اعلانات ہو رہے ہیں گذشتہ مارچ کے المناک واقعات کے بعد مختلف سیاسی لیڈروں بالخصوص پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو سے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر یحییٰ خان کی ملاقاتوں کے نتائج کا کچھ حصّہ سامنے آرہا ہے۔ بھٹو صاحب صدر صاحب سے دس ملاقاتیں کر چکے ہیں۔ وہ مغربی پاکستان میں اکثریتی پارٹی کے قائد ہیں۔ اس لئے ان کی ملاقاتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ اپنی ملاقاتوں، اور پریس کانفرنسوں میں موجودہ حکومت پر یہی زور دیتے رہے ہیں کہ جس قدر جلد ممکن ہو، عوامی نمائندوں کو اقتدار منتقل کیا جائے، کیونکہ بحران کا حل عوام کی شراکت سے ہی ممکن ہے۔ بھٹو صاحب نہ صرف اسمبلی میں زیادہ سیٹیں حاصل کرنے کے باعث اہمیت رکھتے ہیں، بلکہ ویسے بھی ملک کی سب سے اہم سیاسی شخصیت ہیں، ان کے اندازِ فکر اور لائحہ عمل کا ملک پر اثر ناگزیر ہے۔ مغربی پاکستان کی اکثریت نے ان کے پروگرام کو ووٹ دیا ہے۔ اس اکثریت کو ووٹ دیئے نو ماہ ہو چکے، مگر ابھی تک اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اس کی وجہ حالات اور چند شخصیتیں ہیں جو عوام اور اقتدار کے درمیان حائل ہو رہی ہیں۔ اس لئے عوام میں سخت بے چینی پھیل رہی ہے۔

گذشتہ دنوں صدر کی طرف سے دو اہم اعلانات سامنے آئے ہیں۔ ایک یہ کہ صدر اپنی کمیٹی کا تیار کردہ آئین، قومی اسمبلی کے سامنے پیش کریں گے۔ اور اسمبلی کو اس میں ترمیم کا اختیار ہوگا۔ اس کے لئے ۹۰ دن کی مدت دی گئی ہے۔ دوسرے مشرقی پاکستان میں ضمنی انتخابات کے لئے ۲۵ نومبر سے ۹ دسمبر تک کی تاریخ مقرر کردی گئی۔ نامزدگی کے لئے درخواستیں ۲۳ ستمبر تک قبول کی جائیں گی۔ صدر کی طرف سے یہ اعلان ابھی اخبارات میں چھپا بھی نہیں تھا۔ کہ اس کے ساتھ ہی حسب معمول مودودی، دولتانہ، قیوم خان اور بہت سے دوسرے لیڈروں کے مبارک باد اور خیر مقدم کے بیانات بھی چھپ گئے۔ جب صدر یحییٰ نے کہا تھا کہ وہ دستور خود بنائیں گے۔ اور اس وقت بھی ان لیڈرانِ کرام نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ کسی نے

صدر نے وہ یقین دہانی کروادی

جو شیخ مجیب الرحمٰن کروانے

کے لئے تیار نہیں تھے۔!

جرأت نہ کی تھی۔ کہ اسمبلی کو یاد کرلیتا۔ کہ قومی اسمبلی جو عوام کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔ اس کو اس میں ترمیم کا حق ہونا چاہیئے۔ لے دے کے پیپلز پارٹی نے یہ کہنے کی ہمت کی تھی کہ ہمیں صدر کی ۲۸ جون کی تقریر کے بعض نکات سے اختلاف ہے۔ اپنی مختلف ملاقاتوں میں بھٹو صاحب نے صدر یحییٰ کے سامنے اسمبلی کی اس اہمیت پر زور دیا تھا۔ اور مزارِ قائد پر ایک ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے بھی انہوں نے یہی کہا تھا کہ "اسمبلی مطلق الاختیار ہے، اور دستور بنانا اس کا حق ہے۔ جو دستور عوام نہیں بنائیں گے نہیں چلے گا۔" اب صدر یحییٰ نے اسمبلی کو ترمیم کا جو حق دیا ہے۔ وہ اگرچہ جمہوری امنگوں کی مکمل آئینہ داری تو نہیں کرتا۔ نہ مولانا مودودی، دولتانہ اور قیوم خان کی طرح اس پر "ہیل ہیٹلر" کا نعرہ بلند کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ ایک حد تک عوام کی خواہشات کی پاسداری ضرور ہے۔ اس طرح عوام نے جن نمائندوں کو اپنی امانت اور ذمہ داری سونپی ہے۔ ان پر کسی قدر اعتماد ظاہر کیا گیا ہے۔

جمہوری تقاضوں کو یوں نیم دلی سے پورا کرنے کا جانے کون لوگ مشورہ دیتے ہیں، خرابیٔ بسیار اور وقت گزرنے کے بعد بات اور وہ بھی ادھوری بات ماننے سے تاریخ کے صفحات پر جو مایوسی اور بے چینی نقش ہو جاتی ہے۔ اربابِ "تدبیر" کیا اس کا خیال نہیں کرتے۔

جمہوریت تک ابھی بہت سے مراحل طے کرنے ہیں۔ پہلے ضمنی انتخابات ہوں گے، پھر اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے گا۔ اس میں دستور پیش ہوگا۔ ۹۰ روز یا اس سے پہلے ہی۔ اس دستور میں ترمیم کے بعد مرکز اور صوبوں میں منتخب اکثریتی پارٹیاں حکومتیں بنائیں گی

غیر نمائندہ کابینہ اور ضمنی انتخابات

ضمنی انتخابات کے لئے فضا سازگار نہ قرار دینے اور جداگانہ طرزِ انتخاب پر زور دینے والی پارٹیاں اپنے منہ کی کھا کر۔ ان انتخابات میں حصّہ لینے کی تیاریاں کر رہی ہیں، جماعت اسلامی، پی ڈی پی، قیوم لیگ اور کونسل لیگ نے ان انتخابات سے بڑی امیدیں باندھ رکھی ہیں۔ فی الحال قومی اسمبلی کی ۷۰ کے قریب سیٹوں کو خالی قرار دیا گیا ہے، دائیں بازو کی یہ جماعتیں مشرقی پاکستان کی غیر نمائندہ کابینہ وزارتیں حاصل کر چکی ہیں، اپنی وزارت کے پلیٹ فارم کو استعمال کریں گے یوں ان وزارتوں کے عہدوں کا غلط مصرف آئندہ انتخابات جیتنے کے لئے ہوگا۔ ہمیں ڈر ہے کہ یہ وزراء ان انتخابات کو جائز اور منصفانہ رہنے نہیں دیں گے

الفتح

پیپلز پارٹی — آزمائش کے سب سے بڑے موڑ پر

جماعتِ اسلامی کے رضا کار مشرقی پاکستان میں جو کچھ کر رہے ہیں، وہ اخبارات میں آچکا ہے۔ بھٹو اس کی کھل کر مذمت کر چکے ہیں، دائیں بازو کے لیڈروں نے بھی نجی گفتگو میں اس کی تصدیق کی ہے۔ جماعت اسلامی کا خیال ہے کہ وہ ان انتخابات میں بھاری اکثریت لے گی، ۱۹۷۰ء میں بھی اس کا یہی خیال تھا، خیال خیال ہوتا ہے۔

۷۰ سیٹوں کے ضمنی انتخابات کے بعد اگرچہ کورم پورا ہو سکتا ہے۔ لیکن ۸۸ اہل ارکان اسمبلی میں سے بھی دیکھنا ہو گا۔ کتنے دستیاب ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے بارے میں بھی کوئی اعلان جاری ہو کہ یہ اہل ارکان - فلاں تاریخ تک اپنے آپ کو حاضر کریں یہ اٹھاسی کم ٹھاسی بھی سب دستیاب نہ ہوں گے۔ پھر ان میں سے بھی کئی سیٹیں خالی قرار دی جائیں گی۔ پھر ان کے الیکشن ہوں گے۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا ویسے اگر حالات ٹھیک رہے تو شاید اگلے برس جنوری میں اسمبلی کا اجلاس بلا لیا جائے۔ اسمبلی کے اجلاس تک بات پہنچ جائے تو بہت سے خطرات دور ہو جائیں گے۔ اور ملک جمہوریت کی طرف گامزن ہو گا۔

صدر یحییٰ نے دستور کے متعلق ترمیم میں کہا ہے کہ یہ سادہ اکثریت سے مگر تمام وفاقی یونٹوں کی طرف سے تائید کے بعد منظور کر لی جائے گی۔ اس میں تمام وفاقی یونٹوں کی طرف سے تائید کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ یقین دہانی کروائی گئی ہے خیال رہے کہ یہ وہی یقین دہانی ہے۔ جو بھٹو نے اسمبلی میں جانے سے پہلے مجیب سے مانگی تھی۔ اور کہا تھا کہ "ہم اسمبلی میں جانے کے لئے تیار ہیں۔ اگر ہماری بات سنی جائے اور معقول ہو تو تسلیم کر لی جائے۔ ہم پہلے سے تیار شدہ دستور پر انگوٹھا نہیں لگائیں گے۔ یہ یقین دہانی مجیب کروا دیتا تو یہ حالات نہ ہوتے اور یہ خون نہ بہتا —— اب چونکہ صدر نے یہ یقین دہانی کروا دی ہے اس لئے ہمارے خیال میں کسی کو بھی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت سے انکار نہ ہو گا۔۔

عوام اس وقت جن مشکلات اور پریشانیوں کا شکار ہیں ان میں وہ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں سے رابطہ قائم کرتے ہیں وہ جو کچھ بھی کر سکتے ہیں کر دیتے ہیں مگر یہ مسائل کا حل نہیں ہے اس وقت پیپلز پارٹی سب سے بڑی پارٹی ہے عوام سے اس نے وعدے بھی بہت کئے ہیں اس لئے اس کی بڑی ذمہ داریاں ہیں وہ اگر پوری نہ کی گئیں تو عوام کو ورغلانے والے موجود ہیں اقتدار ترجب ملے سو ملے کم از کم اپنے تمام ارکان قومی اسمبلی اور ارکان صوبائی اسمبلی کی مدد سے ان کے متعلقہ علاقوں کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کا جائزہ لے کر رپورٹیں مرتب کی جائیں تا کہ اگر اقتدار ملے تو اپنی اسکیموں پر فوری طور پر عملدرآمد کر کے عوام کی پریشانیاں کم کی جائیں ان مسائل کے ساتھ ساتھ انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کے حل میں کون کون سی طاقتیں رکاوٹیں ڈالتی ہیں تا کہ ان کا پہلے سے قلع قمع کیا جا سکے اقتدار منتقل ہو یا نہ، پیپلز پارٹی اس وقت

باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیں

آئندہ ہفتے

چین میں انقلاب کی سالگرہ

خصوصی تصاویر، مضامین اور نظمیں۔

پیپسی کولا کی ایجنسی سلطنتِ اومان کا تختہ الٹ دے گی

(ایک خصوصی رپورٹ)

دواؤں کی مہنگی قیمتیں مریضوں کی جان لے رہی ہیں

ایک المناک داستان

ناصر کی پہلی برسی پر ایک مضمون

اس کے علاوہ ہمارے مستقل عنوانات

محترم قارئین کرام!

نیوز پرنٹ کی قلت کے دنوں میں ہم نے اپنے صفحات میں بے حد کمی کر دی تھی۔ اس کے باوجود ہمارے قارئین نے ہماری حوصلہ افزائی کی۔ ہم اس کے لئے انتہائی ممنون ہیں اور رہیں گے۔

قیمت وہی

"الفتح" کو اپنے قارئین کی مالی تنگدستیوں کا بخوبی احساس ہے۔ اس لئے ہم نے تمام خسارہ خود برداشت کرتے ہوئے اس وقت بھی اس کی قیمت میں اضافہ نہیں کیا۔ جب تمام اخبارات اور ہفت روزوں نے اپنی قیمتیں بڑھائی تھیں۔

۸ صفحات کا اضافہ

نیوز پرنٹ کی قلت کے باوجود آہستہ آہستہ ہم نے اپنے صفحات کی کمی کو دور کیا ہے۔ اب اس ہفتے سے ہم نے آٹھ صفحات کا مزید اضافہ کر دیا ہے۔ اب کل صفحات ۴۴ ہو گئے ہیں۔ جو گزشتہ سال کے شروع میں تھے۔ اور سائز پہلے کی نسبت بڑا ہے۔ لیکن قیمت ہم وہی برقرار رکھ رہے ہیں۔

ہم اپنے قارئین سے حسب معمول تعاون کی توقع کرتے ہوئے گذارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے حلقہ احباب میں اپنے "الفتح" کو متعارف کروائیں اور ہمیں اپنی رائے سے بھی آگاہ کرتے رہا کریں۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے موقع
پر اس عالمی ادارے کے "کارناموں" کا تفصیلی جائزہ



اقوام متحدہ

ناکامی کی علامت بن چکی ہے

وہاب صدیقی

یہ طرفہ تماشہ ہے کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس ہمیشہ موسم خزاں میں ہوتا ہے۔ اس سال ۲۱ ستمبر کو اجلاس شروع ہو رہا ہے۔ موسم خزاں ہے، خزاں، مایوسی، ناکامی، شکستگی اور حسرت و یاس کی علامت ہے۔ شاید اقوام متحدہ نے یہ موسم اس لئے چنا ہے۔ کہ اقوام متحدہ ناکامی کی علامت بن چکی ہے، دنیا کی مظلوم اقوام کو اس بین الاقوامی ادارے سے مایوسی، ناکامی، شکستگی اور حسرت و یاس کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا۔ اقوام عالم کے حقوق کا تحفظ، امن، عدل و انصاف کا پرچم بلند کرنے کا دعویٰ کرنے والی اقوام متحدہ ظلم، استحصال اور جارحیت کی پشت پناہ بن گئی ہے۔ یہ امریکی سامراج کی لونڈی ہے۔ یہ اُسی کے اشارے پر ناچتی ہے۔ امریکی سامراج کے مفادات پر زد پڑتی ہے تو یہ کوریا اور کانگو میں چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر اپنی امن فوج بھیج کر امن، عدل و انصاف کی دھجیاں اڑا سکتی ہے۔ لیکن اگر امریکی سامراج ویت نام پر تباہ کن ہتھیاروں اور زہریلی گیس کا بھی استعمال تو امن عالم اور عدل و انصاف کو خطرہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا "تحفظ" ہوتا ہے۔ یہ عوامی جمہوریہ چین کو کوریا میں جارح قرار دے کر قرارداد مذمت تو پاس کر سکتی ہے۔ لیکن اسرائیل اور بھارت کو جارح قرار نہیں دے سکتی۔ اور نہ قرارداد مذمت پاس کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہی امریکہ کی مرضی ہے۔ جیسے پیا چاہے وہی سہاگن۔ یہ ادارہ کوئی بھی مسئلہ چند منٹوں میں حل کر سکتا۔ بشرطیکہ امریکی سامراج کا اشارہ ہو، ورنہ یہاں جو مسئلہ لایا جاتا ہے۔ وہ کبھی حل نہیں ہوتا۔ ذیل میں چند بڑے بڑے مسائل کا ذکر ہے، جو ایک مدت سے اقوام متحدہ کے سرد خانے میں پڑے ہیں،

قبرص

قبرص کا تنازعہ ۱۹۶۴ء سے اقوام متحدہ کے سرد خانے میں پڑا ہوا ہے۔ وقتاً فوقتاً اس کی بازگشت اس کے بلند و بالا ایوانوں میں سنائی دیتی ہے، گرما گرم تقریریں ہوتی ہیں، "امن" اور "بقاء انسانیت" کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ اور پھر "اب حالات ٹھیک ہیں" کہہ کر اسے سرد خانے میں ڈال دیا جاتا ہے

قبرص کا تنازعہ اقوام متحدہ کے ۱۹۶۴ء میں پیش کیا گیا۔ جب قبرص کے صدر میکارس نے ترک حلقے کی پانچ میونسپل کونسلیں توڑ دیں۔ ترکوں نے اس اس غیر آئینی اقدام کے خلاف زبردست مظاہرے کئے اور قبرص کی عدالت عالیہ میں اپیل کی۔ قبرصی حکومت نے عوام کی توجہ اس مسئلے سے ہٹانے کے لئے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے فرقہ وارانہ فسادات شروع کر دیئے

ایک رات ان غنڈوں نے ترک مزدوروں کی بستیوں پر حملہ کر کے ۲۰۰ افراد ہلاک کر دیئے۔ حکومت ترکی نے سخت احتجاج کیا۔ اور اپنی فوجوں کو لام بندی کا حکم دے دیا۔ یونان اور ترکی کے درمیان جنگ کی صورت حال پیدا ہو گی، چنانچہ اس موقع پر اقوام متحدہ آگے بڑھی، اور وقتی طور پر یہ طے پایا۔

- قبرص میں اقوام متحدہ کی امن فوج مقرر کی جائے
- ۷۵۰ یونانی اور ۵۰۰ ترک فوجی امن کے لئے قبرص میں رہیں گے،
- حکومت ترکی کو یہ اختیار ہو گا کہ اگر قبرصی حکومت دستور کی خلاف ورزی کر کے قبرصی ترکوں پر ظلم و تشدد کرے تو وہ طاقت استعمال کر سکتی ہے۔

لیکن یونانی حکومت نے ۱۹۶۸ء میں اس معاہدے کی خلاف کرتے ہوئے دس ہزار فوج قبرص بھیج دی۔ اس فوج نے قبرصی ساحل پر اترتے ہی ترک عوام کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا، دو دیہاتوں پر حملہ کر کے سینکڑوں افراد کو ہلاک اور املاک کو نقصان پہنچایا۔ اس پر حکومت ترکی نے از روئے معاہدہ اپنا حق مداخلت استعمال کیا، فوجوں کو تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ اور کئی جنگی بحری جہاز قبرص روانہ کر دیئے۔ امریکی سامراج نے دیکھا کہ جنگ ناگزیر ہو گئی ہے۔ تو صدر جانسن نے اپنا ایلچی بھیجا۔ جس نے حکومت ترکی اور یونان سے صلح، صفائی کی گفت و شنید شروع کر دی، دوسری جانب اقوام متحدہ نے اپنے سرد خانے سے قبرص کا تنازعہ نکالا۔ سلامتی کونسل نے "امن" امن" اور "تنازعہ باہمی گفت و شنید سے حل کیا جائے" کی رٹ لگاتے ہوئے دونوں ممالک کو اپنی فوجیں واپس بلوانے پر زور دیا۔ اور ایک قرارداد کے ذریعے قبرص میں

کشمیر، قبرص، رہوڈیشیا، جنوبی افریقہ، مشرق وسطیٰ میں بھڑکتی آگ تیرا دوسرا نام ہے

اقوام متحدہ کی امن فوج کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔ اور پھر اس تنازعے کو اپنے سرد خانے میں ڈال دیا۔

اب بھی قبرص میں اقوام متحدہ کی امن فوج موجود ہے، ۲۰ مئی ۱۹۷۱ء کو سیکرٹری جنرل اوتھان نے قبرص کے بارے میں سلامتی کونسل میں رپورٹ پیش کی۔ کہ گذشتہ چھ ماہ سے قبرص میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس لئے اس علاقے میں اقوام متحدہ کی امن فوج کی موجودگی ضروری ہے۔ چنانچہ سلامتی کونسل نے یہ قرار داد منظور کی۔

"سیکرٹری جنرل کی رپورٹ مورخہ ۲۰ مئی ۱۹۷۱ء (ایس-۱۰۱۹۹) سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ہم قبرص میں امن چاہتے ہیں۔ تو اس جزیرے میں اقوام متحدہ کی امن فوج کی موجودگی ضروری ہے۔" (سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر ۲۹۳ (۱۹۷۱)

گویا اقوام متحدہ کے نزدیک امن، تنازعہ کے تصفیہ سے نہیں۔ بندوق کی سنگین سے قائم کیا جاتا ہے

ضروری ہے کہ قبرص کے تنازعے کو سمجھنے کے لئے اس کے تاریخی پس منظر بیان کر دیا جائے۔ قبرص رقبہ کے لحاظ سے بحرہ روم کے جزیروں میں تیسرے نمبر پر ہے۔ ترکی کے ساحل ماسیلز سے قبرص کا فاصلہ ۴۰ میل، اردن سے ۲۵۰ میل، عراق کی پائپ لائن سے ۵۰۰ میل اور یونان سے ۷۰۰ میل ہے۔ یہاں کی آبادی ترکوں اور یونانیوں پر مشتمل ہے۔ ترکوں کا تناسب ۲۰ فیصد ہے۔ یونانیوں کی اکثریت ہونے کے باوجود یہاں کبھی بھی یونانی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ البتہ اس جزیرے پر فارس اور روم حکومت کرتے رہے۔ ۱۵۷۵ء میں سلطان سلیم نے اسے فتح کر کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا۔ جب سلطنت عثمانیہ زوال پذیر ہو رہی تھی۔ تو قبرص کا انتظام عثمانی حکمرانوں کے لئے ایک مسئلہ بن گیا۔ دربار ترکی میں انگریزوں کا اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا۔ بحرہ روم میں بھی فوجی اڈہ قائم کرنے کے لئے وہ قبرص پر نظریں جمائے ہوئے تھے کمال مکاری سے کام لیتے ہوئے انہوں نے سلطان ترکی سے درخواست کی کہ قبرص کا نظم و نسق اور انتظامی امور کی ذمہ داری اس شرط پر تاج برطانیہ کے حوالے کر دی جائے۔ کہ قبرص ہر اعتبار سے سلطنت عثمانیہ کا جزو رہے۔ اس شرط پر ۱۸۷۵ء میں قبرص کی انتظامی ذمہ داری برطانیہ کو سونپ دی گئی۔ لیکن جنگ عظیم اوّل میں برطانیہ نے قبرص کو اپنی سلطنت کا جزو بنا لیا۔ اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے برطانیہ نے قبرص میں یونان اور ترک کا سوال اٹھایا اور مذہبی اختلافات سے فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ جب یہاں تحریک آزادی شروع ہوئی۔ تو قبرصی یونانیوں نے مطالبہ کیا کہ قبرص کا الحاق یونان سے کیا جائے۔ قبرصی ترکوں نے ترکی سے الحاق کا مطالبہ پیش کیا برطانیہ نے قبرصی یونانیوں، قبرصی ترکوں، حکومت یونان اور حکومت ترکی کے نمائندوں کی ایک کانفرنس زیورخ میں بلائی جس میں فیصلہ ہوا۔ کہ قبرص کو کامل آزادی ملنی چاہیئے۔ اور ایک آئین کے ذریعے قبرصی یونانیوں اور ترکوں کے حقوق اور اختیارات متعین کئے جائیں۔ اس کے بعد دوسری کانفرنس لندن میں ہوئی۔ اور طے پایا قبرص کا صدر قبرصی یونانی ہوگا، نائب صدر قبرصی ترک ہوگا۔ لیکن نائب صدر کو دفاع، امور خارجہ، ٹیکس اور میونسپل معاملات میں حق تنسیخ حاصل ہوگا۔ ترکوں کو اپنے معاملات میں جداگانہ رائے دینے کا حق ہوگا۔

۱۹۵۸ء میں قبرص کو آزادی مل گئی۔ لیکن نفرت کا جو بیج برطانوی نو آبادکاروں نے بویا تھا۔ اب جڑ پکڑ چکا ہے۔ قبرصی یونانیوں اور قبرصی ترکوں میں

> **اس ادارے نے ظالم اور مظلوم کو ہمیشہ ایک ہی صف میں شمار کیا ہے۔**

اختلاف کی خلیج بہت وسیع ہو چکی ہے۔ قبرص کو اپنے دائرہ اثر میں لینے کے لئے حکومت ترکی اور یونان دونوں اختلافات سے فائدہ اٹھا رہی ہیں اور اقوام متحدہ تنازعہ کے صحیح اور جائز حل کی بجائے امن فوج کے ذریعے "امن" قائم رکھنا چاہتی ہے۔ بظاہر قبرص کی فضا پُرسکون ہے۔ لیکن نفرت جو لاوا اندر ہی اندر پک رہا ہے۔ نامعلوم کب پھٹ نکلے، اور پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔

رہوڈیشیا

رہوڈیشیا کے معاملہ میں بھی پانچ بڑوں کی کٹھ پتلی اقوام متحدہ کی حقیقت دنیا کے عوام پر آشکار ہوگئی۔ جنوبی رہوڈیشیا کی سفید فام حکومت نے ۱۹۶۴ء میں آزادی لینے سے انکار کر دیا۔ اور اسمتھ حکومت نے ۱۹۶۱ء کا قانون برقرار رکھا۔ اقوام متحدہ میں اس مسئلہ پر بحث ہوئی۔ اور ایک قرار داد کے ذریعے حکومت برطانیہ سے کہا گیا کہ وہ جنوبی رہوڈیشیا میں بالغ رائے دہی کے اصول پر جمہوری آئین نافذ کرے۔ برطانیہ نے اس قرار داد پر عمل پیرا ہونے کی بجائے اس پر سخت احتجاج کیا۔ اور بالآخر اوتھان کو اپنی ناکامی کا اعلان کرنا پڑا۔ برطانوی نوآبادکاروں کی درپردہ حمایت و امداد نے اسمتھ ٹولے کی ہمت بڑھائی۔ اس نے نومبر ۱۹۶۵ء میں جنوبی رہوڈیشیا کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ برطانوی حکومت نے اسمتھ حکومت کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے اسلحہ کی ترسیل روک دی۔ لیکن یہ اقدامات دنیا کو فریب دینے کے لئے کئے گئے۔ وزیر خارجہ جارج براؤن نے اپنے استعفے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی کہ وہ جنوبی رہوڈیشیا کو اسلحہ دینے کے حق میں تھے۔ اسمتھ حکومت کی یکطرفہ اعلان آزادی کے بعد اقوام متحدہ نے رہوڈیشیا سے تجارتی تعلقات ختم کرنے اور اسلحہ کی ترسیل روک دینے کی قرار داد منظور کی۔ لیکن پرتگال، فرانس اور جنوبی افریقہ نے رہوڈیشیا کو اسلحہ کی ترسیل جاری رکھی، جنوبی افریقہ نے رہوڈیشیا کو تیل فراہم کیا۔ امریکی سامراج اور برطانیہ بھی درپردہ اسمتھ حکومت کی امداد کرتے رہے۔ اور اقوام متحدہ نے زمبیا، ملاوی اور گھانا کی متعدد درخواستوں کے باوجود طاقت کے استعمال سے انکار کر دیا۔

رہوڈیشیا کی سفید فام اقلیتی حکومت نے ۲۰ جون ۱۹۶۹ء کو نام نہاد اسمبلی کے انتخابات کا ڈھونگ رچایا اور ۲ مارچ ۱۹۷۰ء کو جنوبی رہوڈیشیا کو جمہوریہ بنا دیا۔ تب بھی اقوام متحدہ خاموش رہی اس طرح اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ نمبر ۱ نسل،

امریکہ، برطانیہ اور روس نے عالمی ادارے کو خرید رکھا ہے

جنس، زبان یا مذہب کی تفریق سے بالاتر ہو کر ہر فرد کے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام کی تقویت اور حوصلہ افزائی کے لئے" کی حقیقت کا پول دنیا کے مظلوم عوام پر کھل گیا کہ اقوام متحدہ صرف سامراجی طاقتوں کی ایجنٹ ہے اور یہ منشور محض ایک دکھاوا ہے۔

نومبر ۱۹۷۰ء میں برطانیہ نے سلامتی کونسل میں رہوڈیشیا کے متعلق ایک قرار داد کو ویٹو اور امریکی مندوب نے قرار داد کی حمایت سے اجتناب کرکے ثابت کر دیا کہ اقوام متحدہ میں مظلوم اقوام کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

جنوبی افریقہ

جنوبی افریقہ کثیر النسل لوگوں کا دیس ہے۔ ۱۹۶۷ء کے اعداد و شمار کے مطابق مختلف نسلوں کے لوگوں کی تعداد یہ ہے۔

بانتو	۱،۲۷،۵۰،۰۰۰
سفید فام	۳۵،۶۳،۰۰۰
سیاہ فام	۱۸،۵۹،۰۰۰
ایشیائی	۵،۶۱،۰۰۰
میزان	۱،۸۷،۳۳،۰۰۰

سفید فام کا تناسب ۱۹٫۳ فیصد ہے، اقلیت میں ہونے کے باوجود یہ حکومت اور تمام پیداواری وسائل پر قابض ہے، سیاہ فاموں سے غلاموں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ انہیں بنیادی حقوق بھی حاصل نہیں، ۱۹۰۹ء کے قانون کے تحت صرف سفید فام ہی پارلیمان میں منتخب ہو سکتے ہیں اور صرف سفید فاموں کو ہی ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ صرف چند نشستیں کیپ ٹاؤن اور نٹال کے سیاہ فام اور خالص افریقی باشندوں کے لئے مخصوص کی گئی ہیں ۱۹۶۰ء میں پارلیمان میں بالواسطہ افریقی نمائندگی کا دستور بھی منسوخ کر دیا گیا۔ اور اب حکومت سیاہ فاموں کی نمائندگی بھی ختم کرنا چاہتی ہے۔ اس کا اظہار ۱۹۶۰ء میں وزیر عدلیہ نے یوں کیا "ہم نے ایک ایسی تاریخی حقیقت کے طور پر جو ہم پر مسلط کر دی گئی ہے۔ پارلیمان میں سیاہ فام لوگوں کی نمائندگی کو گوارا کر رکھا ہے۔ اس پارلیمان میں جب جمہوریہ جنوبی افریقہ کی قسمت کا فیصلہ کرنا ہے۔ صرف اور صرف سفید فاموں کو ہی نشست لینے کا حق ہوگا۔"

جنوبی افریقہ کے سفید فام حکمرانوں میں نسلی امتیاز کا جنون اتنا ہے کہ "ایکٹ بابت امتناع مخلوط ازدواج مجریہ ۱۹۴۹ء" کے تحت مخلوط النسل شادیوں کی پاداش میں سخت سزائیں رکھی گئی ہیں، چنانچہ ۱۹۶۴ء میں اس قانون کے تحت ۲۸۲ افراد کو سزا سنائی گئی۔

یہ مسئلہ ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اقوام متحدہ نے اس نسلی امتیاز کی پالیسی کو انسانیت کے خلاف ایک جرم کہہ کر مذمت کی، لیکن اس کے سوا آج تک کچھ نہیں کر سکی، ظالم متواتر مظلوموں پر وار کر رہے ہیں۔ لیکن اقوام متحدہ میں اتنی سکت نہیں کہ وہ ظالم کا ہاتھ روک لے۔

جنوبی افریقہ کی سفید فام، افریقی نو آباد ریاستوں سخت دشمن ہے۔ کیونکہ بعض نو آزاد ممالک سوشلزم کی راہ پر گامزن ہیں، جنوبی افریقہ کا حکمران طبقہ سوشلزم اور مسلح جدوجہد آزادی کا بدترین دشمن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ افریقی ریاستوں پر اکثر حملہ کرتا رہتا ہے۔ اقوام متحدہ نے جنوبی افریقہ کو اسلحہ کی فراہمی روک دینے کی قرار داد منظور کی۔ لیکن اس پر عمل نہیں ہو سکا۔ بلکہ

اقوام متحدہ
مسائل حل نہ کرنے کا
ریکارڈ قائم کر رہی ہے

برطانیہ نے دولت مشترکہ کی سترہویں کانفرنس میں جنوبی افریقہ کو برطانوی اسلحہ کی فراہمی کو ضروری اور اہم قرار دیا۔ اور اسلحہ کی ترسیل جاری کر دینے کا اعلان کر دیا۔ بلبلا اٹھے ہوئے صدر یوگانڈا کو جنوبی افریقہ کو برطانوی ہتھیاروں کی فراہمی کے خلاف سخت رویہ اختیار کرنے کی سزا یہ ملی۔ کہ وہ کانفرنس سے فارغ بھی ہونے نہیں پائے تھے۔ کہ برطانیہ نواز فوجی ٹولے نے ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

افریقہ میں جنوبی افریقہ، پرتگال اور جنوبی رہوڈیشیا سامراجی ٹروجن گھوڑے کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اقوام متحدہ آنکھیں بند کئے ہوئے ہے۔ ایسی بین الاقوامی تنظیم کا کیا فائدہ، جو مظلوموں کو حق نہ دلوا سکے۔

کشمیر

کشمیر کا تنازعہ برطانوی نو آبادکاروں کا پیدا کردہ ہے۔ ریاست جموں و کشمیر ۱۸۴۶ء میں معاہدہ امرتسر کی رو سے وجود میں آئی۔ جمہوریت اور انسانی حقوق کے علمبردار برطانیہ نے ۷۵ لاکھ روپے کے عوض کشمیری عوام کو بھیڑ بکریوں کی طرح مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ لارڈ لارنس جس نے حکومت برطانیہ کی جانب سے جموں و کشمیر کی فروخت کا معاملہ طے کیا تھا، لکھتا ہے "ہم نے خوشحال کشمیریوں کو ڈوگرہ راجپوت، گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ مہاراجہ نے نقد روپیہ ادا کیا، یہ روپیہ اس نے لاہور دربار سے چوری کیا تھا یہ معاہدہ ایک ایسے راجہ سے کیا گیا۔ جس کی اور کشمیری عوام کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ اس معاہدے کے بارے میں کشمیریوں سے کوئی رائے نہیں لی گئی۔ جیسے وہ انسان نہیں لکڑیاں ہوں"

تقسیم ہند کے وقت ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق کشمیر کی آبادی چالیس لاکھ تھی۔ مسلمانوں کا تناسب ۷۷ فیصد تھا۔ کشمیری عوام پاکستان سے الحاق چاہتے تھے۔ اس نے دھوکا دینے کے لئے اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے ساتھ اسٹینڈ اسٹل ایگریمنٹ کر لیا یعنی جو حالات و تعلقات ہیں۔ وہ بحال رہیں گے۔ لیکن بھارتی حکومت نے بھارتی علاقے کی جو فہرست لندن جنرل پوسٹ آفس میں بھیجی اس میں جموں و کشمیر کو بھارتی علاقہ بتایا گیا تھا۔

پھر مہاراجہ نے اس شرط پر بھارت سے کشمیر کا عارضی الحاق کر دیا کہ الحاق کا آخری فیصلہ کشمیری عوام کی رائے سے ہوگا۔ اس عارضی الحاق کی آڑ لے کر بھارتی فوجیں کشمیر میں داخل ہوگئیں۔ کشمیری عوام اور قبائلیوں نے

باقی صفحہ ۳۶ پر ملاحظہ فرمائیں

نظریۂ پاکستان کو برطانوی سامراج کا اشارہ کہنے والے آج اس نظریئے کے علمبردار ہیں

سامع

سنو! آج سے ۴۱ سال پہلے ہمارے دیس کا ایک خوشنوا فقیر الہ آباد میں کھڑا مستقبل کے سینے میں جھانک کر کہہ رہا تھا کہ میری آنکھیں ہندوستان میں ایک عظیم مسلمان مملکت کو دنیا کے نقشے پر ابھرتے ہوئے دیکھ رہی ہیں اور خوشنوا فقیر کے یہ بول مثل شعلہ مثل جوالائے تند و تیز سامع کا دل گداز کر گئے۔ مگر یہ بول گوشت پوست کے پتھر دل نادانوں کا جگر نہ کاٹ سکے۔ کیونکہ یہ بول تو ٹیپو کی للکار

شاہ ولی اللہ کی نوائے سوز

یہ سید احمد خان کی پکار

حالی کی فریاد

اور ان گنت گمنام مردانِ حُر کی صدائے بازگشت بن کر گونجتے تھے جنھوں نے عہد عالمگیر سے لے کر کمپنی بہادر کے سورج کے نصف النہار تک پہنچ پانے تک ملت کی پریشان فکری، خواری و زبوں حالی کا منظر دیکھا تھا۔ یہ تاریخ کے گم گشتہ اوراق تھے۔ بڑے ہی کربناک بڑے دلدوز بڑے روح فرسا۔ آہ یہ اوراق اپنی داستانیں اپنے سینوں میں لے گئے۔ کاش ہم ان اوراق میں جھانک کر دیکھ سکتے کہ آج کہیں تاریخ نے اپنا سفر دوبارہ نہ شروع کر لیا ہو۔ الحذر، الحذر

لیکن خوشنوا فقیر کے یہ بول سامع کو نشانِ منزل دے گئے۔

اور اب سامع گنگ نہیں تھا

اب سامع مبہوت نہیں تھا

اب سامع پریشان نہیں تھا

اب سامع حیران نہیں تھا

یہ بول، یہ للکار، یہ نوائے سوز، یہ پکار، یہ آواز صرف الہ آباد نے ہی نہیں بلکہ اس کرب کی یہ صدا الہ آباد سے اٹھ کر ایک گونج، ایک لپکا، ایک کوندہ بن کر خیبر سے چاٹگام اور ہمالہ سے راس کماری تک سامع کا دل چیر گئی۔ ایک دھن دے گئی۔ ایک لگن پیدا کر گئی اور اپنوں اور پرایوں کے ستم رسیدوں کو ایک ولولۂ تازہ عطا ہوا۔ اور انہوں نے وقت کی آواز پر کان دھرا کہ:

سن وقت کی آواز آتی ہے وہ دورۂ غفلت ختم ہوا
ساغر کو الٹ، بربط کو اٹھا، ہنگامۂ عشرت ختم ہوا
جانبازی کی ساعت آپہنچی، دریائے محبت ختم ہوا
ہیں جام و سبو بے کار اُٹھا
اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

جب سامع نے دل سے دل، قدم سے قدم ملا کر تلوار اُٹھانے کی جہد کی تو اپنوں نے بھی پرایوں سے مل کر آواز لگائی

"ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں ایک انگریز دوسری انڈین نیشنل کانگریس"

لیکن جھٹ کوندا لپکا:

"ہم تیسری طاقت ہیں، فیصلہ ہماری مرضی سے ہوگا!"

ہم دل برما چکے، ہم خون گرما چکے، ہم قدم ملا چکے، ہم راہ بنا چکے اور اپنے رہوارِ شوق کو منزل جنوں کے لئے مہمیز لگا چکے۔ یہ ہمت کے شناور کی گرج تھی۔ یہ کوندا قائداعظم محمد علی جناح کی آواز بن کر لپکا تھا۔ اور سامع خیبر سے چاٹگام، ہمالہ سے راس کماری تک اس پیغام سروش اور نعرۂ مستانہ پر اپنے آپ کو وارنے کے لئے سینہ سپر ہوگیا۔

وقت کی ساعتیں دنوں میں بدلیں، دن ہفتوں میں ڈھلے اور ہفتے مدو سال بن گئے۔ اور ۱۹۴۰ء میں لاہور کی سرزمین نے یہ روح پرور منظر بھی دیکھا، کہ سامع بتانِ خون و رنگ و بو توڑ کر ملت میں گم ہوگیا۔ اور زور حیدرؓ، فقر بوذرؓ، فکر سلیمان کی تصویر بن چکا تھا۔ یہ دھن، یہ لگن، یہ پیغام سروش، یہ نعرۂ مستانہ "پاکستان" ——— بن چکا تھا۔ یہ سوادِ اعظم کا فیصلہ تھا۔

مگر "اپنوں" کی دھائی شروع ہو چکی تھی۔ سیاسی شعبدہ بازوں کا ایک طائفہ چیخ رہا تھا۔

"یہ سوادِ اعظم کا فیصلہ غلط ہے۔ یہ قوم کافرِ اعظم کے جھنڈے تلے سوادِ اعظم سے کٹ گئی۔ یہ پاکستان نہیں بنے گا۔ بلکہ ناپاکستان ہوگا ——— کافرستان ہوگا" ———

علماء کا ایک گروہ کہہ رہا تھا

"قومیں اوطان سے بنتی ہیں، قومیں اوطان سے بنتی ہیں"

اپنوں نے پرایوں کا لقمہ چبایا۔

"یہ تحریک برطانوی سامراج کے اشارے پر چلائی گئی ہے تاکہ سامراج کے خلاف چلنے والی تحریک آزادی کو سبوتاژ کیا جاسکے"

لاکھ نالے آتشِ احساس بھڑکاتے رہے
لاکھ فتنے اک "دیارِ نو" پہ منڈلاتے رہے

اپنے پرائے چیختے رہے۔ سوادِ اعظم نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو خوشنوا فقیر کے خواب کی عظیم تعبیر پالی۔

یہ ارضِ وطن، مہرِ بداماں جہاں تاب
یہ شاعرِ مشرق کے تخیل کا حسیں خواب
یہ قائداعظم کا اجالا ہوا مہتاب
یہ صبحِ درخشاں کا وطن میرا وطن ہے
یہ دیس مرا دیس

یہ ان "اپنوں" کے رخساروں پر سوادِ اعظم کا طمانچہ تھا جو خود سوادِ اعظم سے کٹ گئے تھے۔ "انہوں" نے اعتراف کیا۔

"ہمارا نقطۂ نظر ہار چکا، ہم ہار گئے"۔ اور اس وطن کی مہکتی فضاؤں میں عافیت کے سانس لینے لگے۔ جس کے قیام کی جدوجہد میں انہوں نے ہر گام اور ہر موڑ پر رخنے ڈالے اور روڑے اٹکاتے تھے۔ اب سوادِ اعظم کے مدعی بن گئے۔

پھر سامع نے انہی "اپنوں" کو اس نظریئے کے علم اٹھائے دیکھا جس نظریئے کو وہ برطانوی سامراج کا اشارہ کہتے تھے۔ لیکن سوادِ اعظم انہیں خوب پہچانتے

باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیں

اے نابالغ مدیر۔ پنجاب میں مجیب الرحمانوں کی نہیں چل سکتی

یہ اُردو پنجابی کا مسئلہ ہے یا اورنٹیل کالج کی پرنسپلی کا

الفتح رپورٹ

قیامِ پاکستان کے حصول کے لئے جنگ اور جدوجہد کے دوران جو سیاسی طالع آزما اس تحریک کی مخالفت کررہے تھے، اب وہ اس ملک کو تباہ کرنے کے مختلف راستے ڈھونڈ رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں عوام کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے بعد اب یہ طاقتیں مغربی پاکستان میں بھی انسانوں کا خون بہانے کی خواہش رکھتی ہیں اور مختلف قسم کی منافرتیں پھیلانے کی سرتوڑ جدوجہد کررہی ہیں۔ لاہور کا ایک ہفت روزہ کچھ عرصہ سے دو دھاری تلوار چلا رہا ہے۔ کبھی کسی ترقی پسند اور عوام دوست اردو خواں شخصیت کو "پنجابیوں" کے خلاف کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی کسی ترقی پسند اور عوام دوست پنجابی کو اردو زبان کا مخالف ثابت کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ کوشش یہ ہے کہ تیر کسی نشانے پر بھی بیٹھے اور کوئی ہنگامہ شروع ہوجائے۔ اس کی پشت پر کچھ خجالت زدہ مفاد پرست اور نام نہاد اہل دانش بھی شامل ہیں۔ جن کی تمام زندگی لوگوں کے جائز حقوق غصب کرنے میں گذری، جنہوں نے اپنے گریبانوں میں جھانکنے کی بجائے، دوسروں کے کیڑے نکالنے کی مسلسل کوشش کی

اس ہفت روزہ نے کچھ عرصہ پہلے اورنٹیل کالج کے موجودہ پرنسپل ڈاکٹر عبادت بریلوی کا ایک بہت پرانا خط شائع کرکے انہیں پنجابیوں کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف ثابت کرنے کی کوشش کی، یہ خط بہت پرانا تھا۔ اور بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم کے ایک خط کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے "مجاوروں" نے بھی انتہائی بددیانتی کا ثبوت دیا اور اس خط کو مولوی صاحب کے ترکے میں سے نکال کر اپنے خبیث باطن کی تسکین کے لئے یہ خط ہفت روزہ کے حوالے کردیا۔

ہفت روزہ نے یہ خط شائع کردیا اور ساتھ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی ۱۹۴۸ء، ۱۹۴۹ء کی تحریریں بھی شائع کردیں۔ یہ سب تحریریں ۱۹۵۱ء تک کی ہیں (ان کے بارے میں تو ڈاکٹر صاحب ہی جواب دیں گے کہ ان کا سیاق وسباق کیا ہے) ان پرانی تحریروں کو آج کے حالات میں نکال کر سامنے لانا، سوائے شرپسندی کے اور کیا ہے کہ پنجاب میں بھی لسانی فسادات کی آگ بھڑکا دی جائے۔ ورنہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی طرف سے آج کل کوئی ایسی کوشش یا تحریر دیکھنے میں نہیں آتی۔

جماعت اسلامی انتخابات میں عبرتناک شکست کھانے کے بعد اب لسانی تعصبات، صوبائی تعصبات کے شوشے چھوڑ کر مغربی پاکستان کے امن کو خاکستر کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لئے انہیں کچھ مہرے بھی مل جاتے ہیں۔ نوائے وقت کے مجید نظامی یہ جانتے ہوئے کہ جماعت اسلامی، نوابزادہ نصراللہ خان اور شورش کاشمیری، تحریک پاکستان کے کس قدر شدید مخالف تھے۔ اور انہوں نے اب تک اس مخالفت کے جرم سے برملا توبہ نہیں کی، اس کے باوجود مجید نظامی ان کو ہوا دیتے ہیں۔ مرحوم حمید نظامی کی رُوح بھی تڑپتی ہوگی۔

آج کل مدیر زندگی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بڑھاپے کو خراب کررہے ہیں۔ ان کا سہارا لے کر وہ تعصب کی برق گرانے کی فکر میں ہیں۔ لیکن وہ تو کہتے کہ پنجاب کے عوام اس قدر وسیع الظرف ہیں کہ وہ ہر قسم کے لوگوں کو برداشت کرلیتے ہیں یہ لوگ ایسے شوشے چھوڑ کر خود ہی مایوس ہوجاتے ہیں۔ مدیر زندگی — نہایت غلط جگہ پر بیٹھ کر یہ خبط کررہے ہیں۔ پنجاب میں تو آج تک زبان اور صوبے کے مسائل پر فسادات نہیں ہوسکے ہیں۔

الفتح کو اپنے ذرائع سے اُردو کے ایک نام نہاد عاشق — جو "بابائے اُردو" بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ان کا ایک طویل خط ہاتھ لگا ہے۔ جو انہوں نے بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کو لکھا تھا۔ ہم اس خط کا عکس شائع کررہے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ

- پنجابی کی تحریک چلانے والوں میں پیش پیش ڈاکٹر محمد باقر اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید تھے
- ایک بات بصیغۂ راز عرض ہے کہ مجھے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی وغیرہ پر اعتماد نہیں یہ لوگ ڈاکٹر محمد باقر صاحب کے یارانِ خاص میں سے ہیں۔

یہ پیرا بھی خاص طور پر قابل غور ہے۔

"مجھے خداوند تعالٰے نے یہ سمجھا دیا تھا۔ کہ پنجابی خطّے کی زبان ہے اور اردو کو ابھی خطّے کی زبان بنانا ہے۔ سکھوں اور ہندوؤں کی موجودگی میں ہمیں یہ آسانی تھی۔ کہ ہم پنجابی کو سکھوں کا مسئلہ قرار دے کر مسلمانوں کو اُردو کے حق میں مجتمع کرلیتے تھے"

انہوں نے پنجابی کو سکھوں کا مسئلہ قرار دے دیا ہے۔ اور پنجاب کے کروڑوں عوام جو پنجابی بولتے ہیں اور جن کی مادری زبان پنجابی ہے۔ انہیں بے زبان قرار دے دیا یا انہیں سکھ کہہ کر اپنا دامن جھاڑ لیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ جانتے ہیں کہ پنجاب نے اردو کی خدمت کے لئے کتنی قربانیاں دی ہیں۔ دیگر تمام صوبوں میں مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ مادری زبان پڑھائی جاتی ہے۔ حکومت پاکستان کا محکمہ اطلاعات و مطبوعات سندھی، پشتو، بلوچی، ساری علاقائی زبانوں اور قومی زبانوں اُردو، بنگالی۔ میں ماہانہ رسالے شائع کرتا ہے۔ نہیں شائع ہوتا تو پنجابی میں نہیں ہوتا،

ہر علاقائی زبان میں روزانہ اخبار نکلتے ہیں۔ لیکن پنجابیوں کی یہ قربانی ہے کہ انہوں نے روزانہ اخبار نکالنے کی نہیں سوچی، مگر اس کے باوجود ڈاکٹر سید عبداللہ اور اس قبیل کے لوگ، اور اس کارواں میں مدیر زندگی جیسے شامل ہونے والے نابالغ لوگ ان قربانیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پنجابیوں پر تعصب کا الزام لگا کر انہیں مشتعل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، پرانی تحریریں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنا، اور ایک مسئلہ جو اس وقت سرے سے موجود نہیں ہے۔ اسے ہوا دے کر جگانے کی کوشش کرنے سے آخر کیا مقصود ہے۔ کیا پنجاب اور کیا دوسرے علاقے وہاں تو اس وقت یہ فکر لاحق ہے کہ اس ملک کی تقدیر کیا بننے والی ہے اکثریت تو اقتصادی الجھنوں سے دوچار ہے۔ حالات پر بے یقینی طاری ہے۔ ایسے میں ان مسائل کی طرف توجہ دینے کی فرصت کسے ہے۔ مگر خالی ذہن تو شیطان کے کارخانے ہوتے ہیں؛ جن لوگوں کے خورد و نوش کی ذمہ داری دوسروں نے اٹھا رکھی ہے۔ انہیں نان جویں کی کیا فکر، وہ تو فتنہ پردازی میں ہی مصروف ہوں گے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے یہ خط اگرچہ ۱۷ جون ۱۹۵۱ء میں تحریر کیا تھا۔ مگر ان کے انداز فکر میں اب تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس وقت بھی وہ اُردو کے نام نہاد "ٹھیکیدار" بن کر۔ اپنے مفادات کی تکمیل کے لئے پنجابی ادب، ثقافت اور تہذیب کی بیخ کنی۔ اُردو دوستی کے بھیس میں کرتے تھے اب بھی وہ یہی خدمت انجام دے رہے ہیں، اب انہوں نے "اسلام پسندی" کا لبادہ بھی اُوڑھ لیا ہے انہیں اعتراض ہے۔ اگر بلھے شاہ، سلطان باہو جیسے عظیم صوفی شاعروں، سیف الملوک، ہیر وارث شاہ جیسی عظیم تصنیفات پر کچھ لکھا جائے۔ اور تحقیق کی جائے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ علمی اور تحقیقی کوششوں کو سیاسی سازش کا نام دیتے ہیں انداز بیان ملاحظہ ہو:۔

> یہ لوگ پنجابی کا پروپگنڈہ اُردو زبان کے ذریعے کرتے ہیں۔ اور انہوں نے بڑی ہوشیاری سے ایک ڈھنگ یہ نکالا ہے کہ یوپی کے بعض مہاجروں کو (جو لاہور میں مقیم ہیں) اپنے ساتھ ملا رکھا ہے۔ تاکہ وہ مجلسی اعتبار سے اس خلط ملط کی وجہ سے صوبائی تعصب سے بالا سمجھے جائیں۔ اس تدبیر کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے زیر اثر یوپی کے بعض سادہ لوح مہاجر انہیں اُردو کا بہی خواہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے زیر اثر یہ یوپی والے اب پنجابی زبان کے بعض شاعروں کو اپنے تحقیقی مضامین کا موضوع بنانے لگے ہیں۔

"دام ہمرنگ زمین بود گرفتار شدم"

بلھے شاہ، سلطان باہو، خواجہ فرید جیسے عظیم صوفیاء پر تحقیقی مضامین یا وارث شاہ، میاں غلام رسول جیسے عظیم شعراء پر تحقیقی مضامین دام ہمرنگ زمیں میں گرفتار ہونا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ تصوف و سلوک کے تمام خزینے اسی طرح دفن رہنے چاہئیں۔ سبحان اللہ کیا منطق ہے۔

ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر اب یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ تو بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم سے ہونے والی یہ خط و کتابت — خفیہ یا غیر خفیہ — قومی مفاد کے پیش نظر بلا کم و کاست شائع کی جائے۔ بابائے اُردو کے جو لوگ وارث بنے ہوئے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ قدم بڑھائیں۔ اور اس تذبذب کو ختم کریں۔ ورنہ پھر محب وطن، حق گو اہل قلم "مدیر زندگی"، اور اُردو دوستی کے بھیس میں تعصب کے بیج بونے والوں کا محاسبہ خود کر لیں گے۔ اور عوام اچھی طرح جانتے ہیں کہ اردو پنجابی کا نہیں، اورنٹیل کالج کی پرنسپلی کا مسئلہ ہے۔ اور "مدیر زندگی" کے گوش گزار ہے کہ لاہور لاہور ہے، لاہور ڈھاکہ نہیں بن سکتا۔ یہاں مجیب الرحمانوں کی نہیں چل سکتی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب! اپنے شر انگیز خط کا عکس دیکھئے

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۱۷ جون ۱۹۵۱ء

مخدوم مسلم۔ سلام مسنون۔ کل ایک رقعہ یوم حالی کے سلسلے میں لکھا تھا۔ آج حسب وعدہ پنجابی اردو کشمکش کے سلسلے میں مفصل اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں ایک صاحب نے جنہیں آپ جانتے ہیں (ڈاکٹر محمد باقر صاحب) ایک مقالہ لکھ کر یہ تجویز پیش کی کہ پنجاب میں ابتدائی تعلیم اردو کی بجائے پنجابی میں ہونی چاہیے۔ چونکہ تجویز نئی تھی اسلئے اس کے خلاف کچھ [illegible] ہوا مگر چونکہ تحریک [illegible] نے یہ تحریک کسی کے اشارے سے شروع کی ہے اسلئے وہ اس مقالے کے بعد باہر آیا اور جلد ہی اسکا منظم کام جاری کر دیا۔ اس وقت میری اطلاع کے مطابق اس شخص نے بالواسطہ پنجاب کے تقریباً سب اضلاع میں "انجمن پنجاب" کے نام سے پنجابی کے فروغ کے لیے جماعتیں قائم کر لی ہیں۔ اس انجمن کے مطبوعہ اغراض و مقاصد مجھے دستیاب نہیں ہوئے [illegible] پیش کروں گا۔ ایک بڑا مقصد اس انجمن کا یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اہل پنجاب کو ملکی اور مقامی تہذیب اور روایات سے [illegible] کیا جائے اسکے علاوہ ان روایات کو زندہ رکھا جائے یہ تہذیب [illegible] ہے۔ اس مقصد کے [illegible] حصول کے لیے پنجابی زبان اور ادب [illegible] کی [illegible] کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ مجھے ذرائع سے یہ بتلایا گیا ہے کہ انجمن پنجاب کے مستقبل قریب میں اردو سے کھلم کھلا مقابلہ کرنے کے حق میں نہیں۔ وہ فی الحال اس بات کے متمنی ہیں کہ اہل پنجاب اپنی زبان اور اس کے ادب سے دلچسپی لیں۔ یہ لوگ نہایت ہشیاری سے اردو ادب اور زبان کے حق میں بھی گفتگو کرتے ہیں۔ اور خود کو اس کا

الفتح کراچی

بہ پر جوش حامی کہتے ہیں۔

مندرجہ بالا اغراض و مقاصد سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تحریک علمی و ادبی نہیں بلکہ سراسر سیاسی ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ اہل پنجاب میں پنجاب کی سیاسی عصبیت پیدا کی جائے۔ مگر چونکہ کھلی صوبہ پرستی بوجوہ قابل اعتراض ہوتی ہے اس لیے ان جذبات کے اظہار کے لیے ایک مناسب اور بے ضرر طریقہ یہ نکالا ہے کہ بنگال اور سندھ کے تتبع میں زبان کے سوال کو سامنے رکھا جائے۔

یہ تحریک بڑی منظم ہے۔ ابھی کوئی بڑا آدمی کھل کھلا کر اس میں شریک نہیں ہوا۔ اس کو دانستہ چند نوجوانوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ اس میں پیش پیش ڈاکٹر محمد باقر، مولانا عبدالمجید سالک کے فرزند عبدالسلام خورشید، [illegible] ہیں۔

پیچھے پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور مرزا مقبول بیگ بدخشانی ہیں۔ یہ تحریک پنجابی کا پروپیگنڈہ اردو زبان کے ذریعے کرتے ہیں اور انہوں نے بڑی ہوشیاری سے ایک ڈھنگ یہ نکالا ہے کہ یو پی کے بعض مہاجروں کو (جو لاہور میں مقیم ہیں) اپنے ساتھ ملا کر تاکہ وہ علمی اعتبار سے [illegible] تعصب سے بالا سمجھا جائے۔ اس تدبیر کا نتیجہ یہ ہے کہ [illegible] یو پی کے بعض سادہ لوح مہاجر انہیں اردو کا [illegible] سمجھتے ہیں۔ چنانچہ [illegible] کے زیر اثر یہ یو پی والے اب پنجابی زبان کے بعض شاعروں کو اپنے تحقیقی مضامین کا موضوع بنانے لگے ہیں۔

ع دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

حال ہی میں یونیورسٹی کو انجمن پنجاب کی شاخ سرگودھا کے سکرٹری نے توجہ دلائی ہے کہ پنجابی چونکہ پنجاب کی زبان ہے اس لیے اس کو یونیورسٹی کے نظام تعلیم میں اردو کے مساوی درجہ دیا جائے۔ اس تجویز پر ابھی بحث نہیں ہوئی۔ [illegible] نومبر میں اس پر بحث ہوگی۔ کچھ عجب نہیں کہ اسی عرصے میں انجمن پنجاب کی شاخوں کی طرف سے بھی اسی قسم کا مطالبہ ہو جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ادھر پرائمری کا ذریعہ تعلیم بدل دیا جائے اور ادھر اعلیٰ تعلیم میں پنجابی کا مقام بلند تر ہو جائے تاکہ پنجابی کے ذریعے پرائمری پاس طالب العلم یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ مڈل اور میٹرک کا ذریعہ تعلیم بھی پنجابی ہو

آپ جانتے ہی ہیں میں ہمیشہ اس خطرے کو محسوس کرتا رہا ہوں۔ مجھے خداوند تعالیٰ نے یہ سمجھ دیا تھا کہ پنجابی خطے کی زبان ہی اور اردو کو ایک خطے کی زبان بنانا ہی۔ سکھوں اور ہندوؤں کی موجودگی میں بھی یہ آسانی تھی کہ ہم پنجابی کو سکھوں کا [illegible] قرار دے کر مسلمانوں کو اردو کے حق میں منظم کر لیتے تھے۔ ہر چند کہ اس زمانے میں بھی سر شہاب الدین جیسے پنجابی نواز موجود تھے مگر اب صورت حال بدل گئی ہے۔ پنجابی کی حمایت کی آواز خود مسلمانوں کی طرف سے اٹھ رہی ہے اور آپ کو پتا ہے کہ تحریک دہندہ [illegible]۔ اس وجہ سے مسئلہ نازک اور پیچیدہ ہو گیا۔

جب سے ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے یہ تحریک اٹھائی ہے میں برابر اس مسئلے پر غور کرتا رہا اور اردو کی مدافعت کی تدبیریں سوچتا رہا۔ اس سلسلے میں مختلف احباب سے گفتگو بھی کی اور بعض با اثر لوگوں کو توجہ بھی دلائی مگر معاملے کی پیچیدگی کے پیش نظر (اور نیز ذاتی مصلحتوں کے پیش نظر) اکثر لوگ اس جھگڑے میں الجھنا پسند نہیں کرتے۔ مجھ سے بعض اخبار نویسوں نے کہا کہ آپ اس مسئلے کے متعلق کوئی بیان دیں مگر میں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میری رائے میں پنجابی اردو کشمکش کی نہ کوئی بنیاد ہے نہ اس کا وجود ہے۔ اس لیے بیان بے ضرورت ہے۔ مگر ان اخبار نویسوں نے مجھ سے کہا کہ ان کے دفتر میں روزانہ پنجابی کے حق میں کئی کئی مراسلات پہنچ رہے ہیں (غالباً انجمن پنجاب کی تنظیم کی طرف سے ہوتے ہیں) اس لیے اخبارات کے لیے ممکن نہیں رہا کہ تا دیر اس معاملے میں خاموش رہیں۔ انہیں بہت جلد ایک طرف یا دوسری طرف رائے کا اظہار کرنا پڑے گا — انہی اخبار نویسوں سے یہ معلوم ہوا کہ کچھ عجب نہیں کہ آئندہ سال حکومت پنجابی کے فروغ کے لیے اپنے بجٹ میں معتد بہ رقم منظور کر دے۔

اس معاملے میں میری تجویز یہ ہے کہ تمام معاملے کو بڑی حکمت اور تدبیر سے چلایا جائے۔ میں اگرچہ اس سے پہلے صوبائی زبانوں کے خلاف کھلے تعصب کا اظہار کرتا رہا ہوں کیونکہ اس وقت اس تعصب کو مفید سمجھتا تھا مگر اب سارا کام مصلحت اور تدبیر سے کرنا چاہیے۔ اس لیے اعتدال اور حکمت عملی کے حق میں ہوں

(۱) میری ناقص رائے میں بنیادی بات یہ ہے کہ اس معاملے کو ابھی اخباری مسئلہ نہ بنایا جائے کیونکہ بیان اور سوال و جواب سے اس کو در اہمیت ملتی ہے



(۲) آپ پنجاب کے مسلّم محبانِ اردو کو ذاتی خط لکھ کر
ان کی رائے طلب کیجیے اور یہ جائزہ لینے کی کوشش کیجیے کہ پنجاب
میں کون کون سے محبانِ اردو، اردو سے سچی محبت رکھتے
ہیں۔ چند نام یہ ہیں: مولوی صلاح الدین احمد ایڈیٹر ادبی دنیا
لاہور، سید بشیر احمد ہاشمی ایم۔ اے، ایم ای ڈی پرنسپل سنٹرل ٹریننگ
کالج لاہور، خواجہ دل محمد صاحب ایم۔ اے سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور،
ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب بار ایٹ لا صدر پنجاب اسمبلی (انہیں
توجہ دلائیے کہ جس انجمن حمایت اسلام کے پلیٹ فارم سے اردو
کے قومی درجے کا مطالبہ ہوا تھا اب اسی اس کے خلاف آواز بلند
ہو رہی ہے)، حکیم احمد شجاع صاحب سیکرٹری پنجاب اسمبلی، سید امتیاز علی
تاج ایبٹ روڈ لاہور، حامد علی خان صاحب ماڈل ٹاؤن (لاہور)،
ڈاکٹر خان اے رحمان صاحب ایم۔ ایس سی ڈی ایس سی، ڈین آف یونیورسٹی
انسٹرکشن پنجاب یونیورسٹی لاہور، ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم صاحب
ایم۔ اے پی ایچ ڈی لاہور، قاضی محمد اسلم صاحب ایم۔ اے (کنٹب)
قائم مقام ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب، ڈاکٹر عبد الوحید
صاحب پی ایچ ڈی کورٹ سٹریٹ لاہور، جناب حمید نظامی مدیر
مجاہد لاہور، جناب خلیل صحافی مدیر مغربی پاکستان لاہور۔ جناب
چراغ حسن حسرت مدیر امروز لاہور (ان اصحاب صاحبوں کو ذاتی
خط لکھ کر پنجابی کے فروغ کی تحریک کے حوالے سے استفسار حال کیجیے
اور انہی لوگوں سے انٹرویو چھپیے)

(۳) وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کو پر زور الفاظ میں توجہ
دلائیے کہ پنجاب یونیورسٹی اور حکومت پنجاب کی مسلّمہ
اور مشتہرہ پالیسی کے باوجود یونیورسٹی کا ایک ملازم یونیورسٹی
کی سنڈیکیٹ اور سینیٹ سے منظوری لیے بغیر اور ان کے مشورے
کے بغیر اردو کے خلاف کام کر رہا ہے (میں سمجھتا ہوں
کہ یہ اقدام خود ملازمت کے قواعد کے خلاف ہے
وائس چانسلر صاحب اگر چاہیں تو بازپرس کر سکتے ہیں۔ میاں بشیر احمد
نے بھی انہیں لکھا ہے اور میں بھی توجہ دلا چکا ہوں)
ڈاکٹر خان اے رحمان صاحب ڈین آف یونیورسٹی انسٹرکشن پنجاب یونیورسٹی
کو جو خط لکھا جائے اس کا مضمون بھی اسی کے قریب ہو۔

(۴) اردو زبان کے متعلق مرکزی حکومت کی رائے جتنی اچھی ہوگی
اتنا ہی اچھا اثر صوبے قبول کریں گے۔ جتنی تاخیر اس کے
درجہ کو بلند کرنے کے سلسلے میں مرکز میں واقع ہوگی اسی قدر
برا اثر صوبوں پر پڑے گا

(۵) پنجاب یونیورسٹی اور فیڈرل یونیورسٹی میں جلد از جلد اردو
کو بہ استثنا ذریعہ تعلیم بنایا جانا چاہیے جتنی تاخیر اس میں ہوگی اسی نسبت
سے نئے نئے فتنے پیدا ہوتے جائیں گے۔ میں نے اسی لئے آپ کی کانفرنس
میں سخت رویہ اختیار کیا تھا۔ اگر پنجاب میں اردو یونیورسٹی
کے مضامین کا ذریعہ تعلیم و تدریس جلد بن جاتی ہے تو پنجابی سوسائٹی کی کوشش
سے بھی اردو کو گزند نہ پہنچ سکے گی۔

اس لئے ضروری ہے کہ چانسلر اور وائس چانسلر اس مسئلے میں
ذاتی دلچسپی لیں۔ ڈاکٹر ملک صاحب نے ۲ سال میں اردو کے لئے
بہت کچھ کر دیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ نشتر صاحب کو تبدیل کیا جا رہا
ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پنجاب میں اردو کو مزید نقصان پہنچے گا۔
اور اگر کوئی صوبائی ذہن کا گورنر مسند آرا ہو گیا تو پھر خدا حافظ۔
یہ مسئلہ بھی زیرِ غور رہے

(۶) ضرورت ہے کہ اردو کی ترقی و توسیع کی جو جو سکیمیں
پنجاب میں یا مرکز میں چل رہی ہیں ان کو کامیاب بنانے کے لئے
زیادہ سرگرمی سے کام کیا جائے۔ جہاں تک ممکن ہو تعطل کی
صورت پیدا نہ ہونے دی جائے۔ ترقی کی ان سکیموں کی کامیابی کا نتیجہ یہ ہوگا
کہ اردو بہ حیثیت ذریعہ علوم اتنی ترقی یافتہ اور پیش پیش
ہوگی کہ صوبوں والے اس سے الگ ہونے سے پہلے کئی مرتبہ
سوچیں گے۔ میں اس کو Defensive Offensive
کہا کرتا ہوں اور میرے خیال میں بڑی کامیاب تدبیر ہے
میں اردو کی مدافعت کے لئے ہر قربانی کے لئے تیار ہوں
از راہ کرم مجھے صورتحال سے مطلع فرماتے رہیے تاکہ مجھے
آپ کے تاثرات کا اندازہ ہوتا رہے

ایک بات بصیغہ راز عرض ہے کہ مجھے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
وغیرہ پر اعتماد نہیں یہ لوگ ڈاکٹر محمد باقر صاحب کے یارانِ خاص میں
سے ہیں۔ ان لوگوں کو اردو سے زیادہ ملازمت کے گریڈ عزیز
ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ لوگ اردو کو اپنے مفاد پر قربان
کر رہے ہیں۔ زیادہ لکھنا مصلحت کے خلاف ہے

خط طویل ہو گیا ہے معافی چاہتا ہوں والسلام اور رخصت ہوتا ہوں
نیاز مند سید عبد اللہ

اس عنوان کے تحت ہم قارئین کی دلچسپی کے لئے مطبوعہ چیزیں شائع کر رہے ہیں۔ اس بار جناب محمود شام کا طنز و مزاح سے بھرپور مضمون نذرِ قارئین ہے ——— (ادارہ)

رشتہ مطلوب ہے

محمود شام

ایک غزل گو شاعر کے لئے ایک خیالی اور روایتی محبوب کا رشتہ مطلوب ہے۔ شاعر اپنے آپ کو اردو شاعری کے گنے چنے اساتذہ کا ہم پلہ سمجھتا ہے، روایاتِ شاعری کا پورا پورا محافظ ہے۔ غزل کے مخصوص دائرے سے کبھی باہر نہیں نکلا کبھی شریعتِ شاعری کے خلاف قدم نہیں اٹھاتا، ہمیشہ پرانی تلمیحات و اصطلاحات کا ورد کرتا رہتا ہے سنگلاخ سے سنگلاخ زمینوں میں شعر کہہ لیتا ہے نہایت ہی لاغر اور نحیف ہے اسوکھ سوکھ کر کانٹا ہو چکا ہے۔ آنکھیں اندر کو دھنس چکی ہیں چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی ہیں، بال پریشان نظر کمزور ہے یہ اور بات ہے کہ پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر لا سکتا ہے ہمیشہ جنگلوں میں پھرتا رہتا ہے آبلہ پائی اس کی نمایاں پہچان ہے دشت کا ہر کانٹا اس کے خون سے سیراب ہے، پہاڑوں کے ہر پتھر پر اس کا نقشِ کفِ پا موجود ہے رات کتنی اندھیری ہو، بادل چھائے ہوں، راستہ نظر نہ آتا ہو مگر وہ تیر کی طرح سیدھا نکل جاتا ہے آسمان سے ستاروں کو توڑ لاتا ہے، اس کی فغاں آسمان کے پرخچے پھاڑ دیتی ہے کبھی خدا سے بھی چھیڑ چھاڑ کر لیتا ہے اڑتی خوشبو کا پیچھا کر سکتا ہے۔ لاغر اور نحیف ہونے کے باوجود وہ مثالِ جرأت اور بہادری کا نمونہ ہے۔ محبوب کی آنکھ کا ہر تیر اپنے دل پر برداشت کرتا ہے تختہ دار پر جانے کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہتا ہے مقتل کو بڑے ذوق و شوق کے ساتھ جاتا ہے۔ تلواریں، خنجر اسے مرعوب نہیں کر سکتے۔ عشقِ حقیقی کی اس منزل پر جا پہنچے ہیں، جہاں تک بہت کم لوگوں کی رسائی ممکن ہے اب وہ تقریباً اپنی ذات رفنا کرنے والا ہے۔ آہ و فغاں گریہ و زاری اس کا شیوہ ہے، ہر وقت آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے ہیں۔ اس قدر روتا ہے کہ دریا ہی بہنے لگ جاتے ہیں۔ کیونکہ اسے شبنم کی طرح رونا نہیں آتا۔ وہ تو ہیں اسے رات کو روک دیتے ہوں۔ ورنہ اس کے آنسوؤں کا سیلاب تو آسمان سے باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔ آسمان کی سطح سیلاب کی جھاگ معلوم ہوتی ہے۔ اس کا دل مسلسل صدمات ہجر سہنے کی وجہ سے نہایت خستہ حال ہو چکا تھا۔ اس پر جگہ جگہ داغ پڑ چکے تھے۔ جانے اس کا محبوب رہزن تھا کہ دلستان، دل لیتے ہی روانہ ہو گیا۔ اب وہ بے دل ہے، اگر اس کے پاس دل ہوتا تو داغوں کی بہار دکھاتا۔ ہائے کیا چراغاں تھا! افسوس یہ چراغاں کا مرکز ہی جل بجھا۔ جگر خون خون ہو چکا ہے۔ سینہ ایک ویران مکان کی طرح ہے جس کا باسی مدت ہوئی جا چکا ہے۔

ان خوبیوں کے مالک اور بے حد و دار لعبہ رکھنے والے شاعر کے لئے رشتے کی ضرورت ہے رشتے کے خواہش مندوں کو مندرجہ ذیل شرائط پر پورا اترنا چاہیئے:۔

(۱) جہاں تک ممکن ہے امیدوار کو انسانوں کی صنف میں سے بالکل نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں غیر انسانی اور مختلف جانورانہ خصوصیات کی موجودگی ضروری ہے۔ مثلاً اس کا قد سرو کا، آنکھیں نرگس کی لب گلاب کی پنکھڑیاں، عارض گلاب، آواز بلبل کی، چال ہرن کی ہو۔ اس کی نگاہیں تیروں کی طرح تیز ہوں۔

(۲)۔ امیدوار حسن و جمال کا پیکر، خوب صورتی کا مرقع ہو ایسے دیکھ کر چاند بھی شرماتا ہوا دل سے گہن لگ جائے، اگر اپنے چہرے سے نقاب اٹھائے تو دونوں عالم اس کی روشنی میں غرق ہو جائیں۔ تارے ماند پڑ جائیں۔ کہکشاں لاپتہ ہو جائے، سورج کہیں ڈوب مرے، شاعر حیران و مبہوت کھڑا رہ جائے، اس کے حسن کے دبدبے کی وجہ سے اپنی آنکھیں جھکا لے، اس میں اس کی طرف دیکھنے کی سکت نہ ہو تاکہ شاعر یہ شکوہ کر سکے کہ میں جی بھر کے اسے دیکھ نہ سکا یا ملاقات کے باوجود میں اس کے جلوے سے محروم رہا۔ حسین ہو کہ وہ دعوے کر سکے

کیا کیجیے اصلاحِ خدائی کو ورنہ
کافی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا

(۳)۔ اس کا چہرہ چاند کی طرح روشن سورج کی طرح دہکتا ہو۔ رخسار اتنے تابناک ہوں کہ اگر وہ کسی محفل میں بیٹھا ہو اور شمع جل رہی ہو تو پروانے اس کے رخساروں کو شمع سمجھ کر اس کا طواف کرنے لگیں، شمع بیچاری حسد کی آگ میں جل جل کر راکھ ہو جائے صبح کو اہلِ مجلس کہتے ہوئے پائے جائیں کہ

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

(۴) اس میں حرارت اتنی ہو کہ شاعر اپنے دل حزیں یا ستم زدہ جگر کو سینک سکے۔

(۵) رخساروں کی رنگت کبھی کبھی گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح ہو، کبھی سیب کی مانند کبھی لالے کی صورت۔ اہلِ فن حیران رہ جائیں کہ اس کے رخساروں کو کس سے تشبیہ دوں۔ نہ لالہ کا رنگ ایسا ہے اور نہ ہی سنبل میں ایسی خوشبو ہے۔

(۶) اس کے لب شراب کی طرح سرخ ہوں ان میں شیرینی اور جاذبیت ہو، ان سے ایسی ایسی میٹھی گالیاں نکلیں کہ انہیں کھا کر رقیب بے مزہ نہ ہو، اتنی سرخی اور خوب صورتی ہو کہ شاعر کا خواہ مخواہ مرنے کو جی چاہتا رہے، وہ اس چیز کا خواہاں رہے کہ کاش میرا احمریں ہونٹوں والا محبوب مجھے قتل کر دے تاکہ مرتے دم تک میں اس کے ہونٹوں کو دیکھنے کا شرف حاصل کرتا رہوں۔

(۷) آنکھیں ہرن کی ہوں ان سے وحشت ٹپکتی ہو خمار جھلکتا ہو۔ وہ شراب کے ساغر معلوم ہوں جب

یہ مرضِ عشق ہے ۔ یہ لاعلاج ہے

وہ نیم باز ہوں تو شاعر پکار اٹھے کہ

میران نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

یعنی درخواست دہندہ کی آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہو، ان کی کیفیت شاعر کے ذہن میں اس طرح محفوظ ہو کہ جب وہ مے خانے میں جائے تو جام کو دیکھ کر کیفیت چشم یاد آ جائے اور پھر وہ شور مچا دے کہ مجھے اس کی آنکھوں کی کیفیت یاد ہے کہ

ساغر کو مرے سے لبِ سنا کہ چلا میں

آنکھوں میں اتنی مستی بھی نہ ہو کہ شاعر اپنے ساتھیوں کو ساغر تھمانے سے پہلے ہی بے ہوش ہو جائے اگر کبھی محبوب مے خانے میں آ جائے تو اسے چاہیئے کہ بے رخی برتے تاکہ لوگ اس کی آنکھوں سے ہی شراب نہ پیتے رہیں اور پیمانے وغیرہ بے کار پڑے رہ جائیں

(۸) مستی کے علاوہ اس کی آنکھوں کو کمین گاہ کا منصب بھی ادا کرنا ہو گا۔ ان سے تیز تر اور مہلک قسم کے تیر نکلنے چاہئیں جو شاعر کے دل پر لگتے ہی اسے پارہ پارہ کر دیں۔ غمزہ، عشوہ اور دز دیدہ نگاہی میں تجربہ رکھنے والوں کو ترجیح دی جائے گی اس بات کا خیال بھی رکھنا ہو گا کہ آنکھوں سے تیر ہمیشہ سیدھے چلیں کیونکہ شاعر یہ طعنہ بھی دے سکتا ہے کہ

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

جب وہ کسی بارونق جگہ بازار یا سڑک سے گذرے تو اس کے دائیں بائیں دونوں آنکھوں سے تیروں کی موسلا دھار بارش ہونی چاہیئے اور راس کے بین دلیار کشتوں کے پشتے لگ جائیں۔

(۹) امیدوار کے سر پر زلفیں نہیں، بلکہ کالے سانپ ہوں انہیں دیکھ کر تماشائیوں کی یہ حالت ہو کہ وہ چیخ اٹھیں کہ مار آیا۔ لیکن یہ مار صرف شاعر کے رقیبوں کو ڈستے ہوں اور انہیں ہی ڈرانے والے ہوں۔ ہمارے شاعر سے بالکل تعرض نہ کریں۔ یہ سانپ اتنے زیادہ ہوں کہ اگر کبھی کبھار شاعر کا دل ان میں پھنس جائے تو اس کا کچھ پتا نہ چلے، کبھی یونہی دل کا خون چھلک پڑے تو شاعر چلائے کہ تری زلف میں چشم بد دور کیا ہے۔ زلفیں شب یلدا کی مانند سیاہی کی انتہا تک پہنچی ہوئی ہوں۔ چہرہ اور زلف بالکل ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ چہرہ اگر صبح ہو تو زلف اندھیری رات تاکہ حسب ضرورت اگر وصل کی شب محبوب دیر سے آئے، رات ختم ہونے والی ہو تو ان سے فائدہ اٹھا سکے کیونکہ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے

نہ اندیشے کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی
تم اپنی زلف تو کھولو سحر ہو وے تو میں جانوں

زلفوں کی لمبائی بھی اتنی ہی ہو تو چاہیئے کبھی کبھی محبوب کا پاؤں بھی اس میں الجھے اور وہ جھنجھلا کر گر پڑے شاعر ہنس ہنس کر کہے کہ لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔

اس کے کاکل بھی نہایت سرکش ہوں۔ ہزار کوشش کے باوجود کسی شے سے نہ دب سکیں۔

(۱۰) ۔ محبوب کی کمر نہ ہونی چاہیئے اگر ہو بھی تو نہایت ہی غیر محسوس حالت تک کہ اس کا پتہ ہی نہ چلے لیکن

نزع کا عالم ہے

اب تو چلے آؤ

وہ اس کا چرچا ضرور کرتا رہے۔ ویسے اس فرض کو شاعر بھی بطریق احسن سرانجام دے گا۔ لوگ بھی یہ کہتے پھریں گے کہ

سنا ہے کہ صنم کے بھی کمر ہے۔
کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے

اس باریک کمر کا خیال شاعر کے ذہن پر محیط ہو گا تو وہ شعر بھی باریکیوں والے کہہ سکے گا۔ اس لیے غیر معلوم کمر والے امیدواروں کو فوقیت دی جائے گی۔

(۱۱) اس کا قد اتنا ہو کہ دنیا کے پیمانے اسے نہ ماپ سکیں۔ کم از کم دنیا میں سرو کے بلند ترین پودے کے برابر ہو اور زیادہ سے زیادہ اس قدر کہ جب وہ انگڑائی لے تو اس کے ہاتھ ستاروں کو چھو سکیں۔ اور ان سے بھی مہندی کی خوشبو آنے لگے۔ اس کی چال قیامت ہو۔ جب کہیں سے گذرے تو اس کی چال اور قد سے محشر بپا ہو جائے۔ دلوں کے مکان زلزلانے لگیں۔ اہل دل دل تھام کر گر پڑیں۔ اور بالکل محشر کی سی کیفیت طاری ہو جائے۔ چچا غالب بھی کفن پھاڑ کر لو ہیں کہ

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

(۱۲) آواز بلبل کی سی سریلی، معجز نما اور مسحور کرنے والی ہو۔ اس غیرت ناہید کی ہر تان دیپک ہو۔ آواز بلند ہوتے ہی شعلے بھڑکنے لگیں۔ اس آواز میں ایسا جادو ہو کہ شاعر اس کا شیدائی ہی رہے خواہ وہ اس کے قتل کا حکم ہی کیوں نہ دے رہی ہو۔ اس کی آواز سنتے ہی مست اور بے حس ہو جائے۔

(۱۳) اس کو ستم، جفا، تغافل، سادگی پرکاری، عیاری بیخودی، ہشیاری، وعدہ خلافی اور اس قسم کی ساری خصوصیات کا حامل ہونا چاہیئے۔ جن امیدواروں کے پاس ان کے باقاعدہ سرٹیفکیٹ یا تمغے ہوں وہ شاید جلد کامیابی حاصل کر سکیں۔

(۱۵) محفل آرائی میں مہارت بھی ضروری ہے۔ ایسا انتظام ہو کہ تانتا بندھا رہے عاشق کی سر محفل بے عزتی کی جائے۔ غیروں کو اچھی نگاہ سے دیکھے شاعر کو نہایت کم اور بری نظروں سے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہو کہ شاعر کہے کہ بزم ناز غیر سے تہی ہونی چاہیئے۔ تو امیدوار اسے ہی اٹھا دے کہ یوں۔

انتظام ایسا کہ گھٹتی ہی نہیں رونق بزم
مجھ سے کہتے ہیں کہ وعدے پہ لگا رکھا ہے

(۱۵) وعدہ کرنا اور پھر وعدہ خلافی کرنا اس کی ممتاز عادات ہوں۔ ان میں وہ آج کل کے افسروں سے بھی دو چار قدم آگے ہو۔ وعدہ خلافی میں اتنا تیز ہو کہ

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

ہر روز ملنے کا وعدہ کرے مگر کبھی نہ ملے۔ اس کی گفتگو میں بھی منافقت مترشح ہونی چاہیئے۔ اس

باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمایئں

Woman Thinks She Buried a Stranger Instead of Husband



میرے شوہر کی قبر میں غلط آدمی کو دفن کر دیا گیا

نون - الف

"اس قبر میں میرے شوہر کی بجائے ایک غلط آدمی کو دفن کر دیا گیا ہے۔"

دوسرے دن کینیڈا کے تمام اخبارات نے یہ خبر نمایاں طور پر شائع کی۔ ٹورنٹو کی ایک عورت مسز وائلٹ رائڈر نے پولیس پر الزام عائد کیا کہ اس کے شوہر کی قبر میں ایک غلط آدمی کو دفن کر دیا گیا۔ اس کا شوہر زندہ ہے جب کہ پولیس زبردستی اس سے یہ منوانا چاہتی ہے کہ اُس کا شوہر مر گیا - اور مرنے والا اسی کا شوہر ہی ہے۔"

صوبائی اسمبلی کے ایک رُکن ڈاکٹر شلومان نے بھی اس عورت کے بیان کی تائید کرتے ہُوئے کہا۔ "ٹورنٹو کی تاریخ کا یہ سب سے المناک واقعہ ہے کہ پولیس اپنی ناکامی اور سنگین غفلت پر پردہ ڈالنے کے لئے ایک عورت کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ ایک ایسے مُردے کو جو اس کا شوہر نہیں ہے اپنا شوہر تسلیم کر لے۔ اس طرح ٹورنٹو پولیس اس کیس کو یہیں ختم کر کے اپنی ناکامی پر پردہ ڈال دینا چاہتی ہے :" ڈاکٹر شلومان نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ "ٹورنٹو پائن ہل کے قبرستان میں دو روز قبل مسز وائلٹ رائڈر کے شوہر کی قبر میں جس غلط مُردے کو دفن کیا گیا اس کی لاش نکال کر دوبارہ تحقیقات کی جائے، جھوٹ سچ کا پتہ چل جائیگا"

مسز وائلٹ اور معزز رکن ڈاکٹر شلومان کے اس مطالبے کو رد کرتے ہُوئے ٹورنٹو کے حکام نے کہا:

"ہرگز نہیں، یہ کیس ختم ہو چکا ہے"۔

مسز رائڈر کی عمر ۴۲ سال کے لگ بھگ ہے۔ اس نے اس حادثے پر اخباری نمائندوں سے باتیں کرتے ہُوئے کہا۔ "آپ لوگ میری جذباتی کش مکش کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ پولیس اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے۔ مجھے مجبور کیا جا رہا ہے کہ میں ایک مُردہ شخص کو اپنا شوہر تسلیم کر لوں۔ میں کسی شہادت کے بغیر یہ بات نہیں مان سکتی کہ میرا شوہر مر چکا ہے یا زندہ"۔

وہ کافی عرصہ سے اپنے شوہر سے علیحدہ رہ رہی تھی۔ کسی بات پر اُن کی آپس میں کھٹ پٹ ہو گئی تھی۔ دو روز پیشتر اسے اچانک ایک ٹیلیفون کال کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ اس کا شوہر جو ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے ٹورنٹو ہوٹل کے ایک کمرے میں مردہ پایا گیا۔ اس کے تین واقف کاروں نے لاش کی شناخت کر لی لیکن جب اُس نے خود لاش کی شناخت کے لئے پولیس سے اجازت مانگی تو پولیس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا "لاش بُری طرح بگڑ گئی ہے۔ آپ برداشت نہیں کر سکیں گی"۔ مسز رائڈر نے کہا "میں نے جتنی بار لاش شناخت کرنے پر زور دیا، اتنی ہی سختی سے مجھے روکا گیا۔ آخر اس میں کیا راز ہے"؟ مسز رائڈر کو مجبوراً اپنے شوہر کو دیکھے بغیر اس کی آخری رسوم میں شرکت کرنی پڑی۔

مسز رائڈر کو جب پوسٹ مارٹم رپورٹ ملی تو اس کے شبے کو مزید تقویت پہنچی، مرنے والے کی جسمانی تفصیلات اس کے شوہر سے مختلف نکلیں، پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق ہوٹل کے کمرے میں مردہ حالت میں پائے جانے والے شخص کا قد ۵ فٹ ۱۰ انچ تھا جبکہ اس کے شوہر کا قد ۵ فٹ ۸ انچ تھا۔ اس مردہ آدمی کا وزن ۱۸۰ پاونڈ تھا۔ اور اس کے شوہر کا وزن ۱۶۵ پاونڈ تھا۔ اس کے علاوہ اس اجنبی آدمی کے متعلق بتایا گیا کہ اس کے بال سرخی مائل تھے۔ جبکہ اس کے شوہر کے بال گہرے بھورے

"یہ المناک واقعہ ہے" ـــــ صوبائی اسمبلی کے رکن کا احتجاج

تھے۔ مردہ آدمی کے دائیں ہاتھ میں کوئی نشان نہ تھا۔ اس کے شوہر کے دائیں ہاتھ میں زخم کا ایک گہرا نشان تھا ــــ یہ ایسے حقائق تھے جنہیں کوئی صحیح الدماغ آدمی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مسز رائنڈر زبردستی بنائے جانے والے مردہ شوہر کی میت میں ضرور شریک ہوئی مگر اس نے اسے اپنا شوہر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

مسز رائنڈر کے شوہر کو قریب سے جاننے والے صوبائی مقننہ کے معزز رکن ڈاکٹر شلومان نے اس کے بیان کی پوری تائید کرتے ہوئے کہا ــــ "پولیس اپنی مجرمانہ غفلت اور کوتاہی پر پردہ ڈالنے کے لئے حقائق چھپا رہی ہے۔" انہوں نے صوبائی اٹارنی جنرل آرتھر وبشارٹ پر زبردست تنقید کرتے ہوئے کہا "اس آدمی نے اس کیس کی از سرِ نو تحقیقات سے انکار کر کے اپنے فرائض منصبی سے روگردانی کی ہے۔ سرکاری مشینری کے یہ کل پرزے محض اپنا جرم چھپانے کے لئے حقائق کو مسخ کر رہے ہیں۔" ڈاکٹر شلومان نے پولیس رپورٹ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا "اصلی اور نقلی ہیرالڈ رائنڈر کی قد میں زبردست تفاوت اس بات کا ایک وزنی ثبوت ہے کہ دفن کئے جانے والا آدمی اصلی ہیرالڈ رائنڈر نہیں ہے۔" ڈاکٹر شلومان کے اعتراض کے جواب میں پولیس کے ایک ترجمان نے بتایا "یہ تفاوت لاش خراب ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے"

ڈاکٹر شلومان نے پولیس کے اس بیان کو لغو قرار دیتے ہوئے کہا "بکواس ہے ڈھانچہ نہیں بڑھتا۔ علاوہ ازیں لاش کے مسخ ہونے سے ایک انچ کے اضافہ کو مانا جا سکتا ہے لیکن ۲ انچ کا اضافہ ناقابل فہم ہے"۔

مسز رائنڈر کے لڑکے رابرٹ نے بھی اپنی ماں کے بیان کی تائید کرتے ہوئے اعلان کیا "مرنے والا اس کا باپ نہیں ہے بلکہ اس کے باپ کی جگہ کسی دوسرے آدمی کو دفن کر دیا گیا میرے والد زندہ ہیں، اگر وہ زندہ نہیں ہیں تو پولیس نے ان کے مردہ جسم کو ہم سے چھپانے کے لئے کہیں اور دفن کر دیا۔ ممکن ہے پولیس نے انہیں کسی جھوٹے کیس میں الجھا کر ان پر اتنا تشدد کیا ہو کہ وہ مر گئے، ان کی جگہ کسی دوسرے مردہ آدمی کو ہم سے متعارف کرایا گیا جو دل کے دورے سے ہلاک ہوا تھا۔ اس طرح اگر ہم لوگ ان کی موت کی تحقیقات پر واویلا کریں، تو پولیس سرجن کی رپورٹ سے ثابت کیا جا سکے کہ مرنے والا طبعی موت مرا۔ اور کیس ختم کر دیا جائے۔"

اصلی ٹیکسی ڈرائیور ہیرالڈ ای رائنڈر کے خاندان کے افراد کا خیال تھا کہ جس انداز میں ہیرالڈ کی پراسرار گمشدگی وقوع پذیر ہوئی، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اگر ہیرالڈ زندہ ہے تو اس نے اب تک ہم لوگوں سے رابطہ قائم کیوں نہیں کیا۔ اگر مر چکا ہے تو کم از کم یہ آدمی ہرگز ہیرالڈ نہیں ہو سکتا جس کی تدفین پر ہم سب جمع ہوئے تھے مسز رائنڈر بار بار کہتی رہی ــــ اگر قبر سے دوبارہ لاش نکال کر تحقیقات کی جائے تو سارا معاملہ آئینہ کی طرح صاف ہو جائیگا

اس واقعہ کے چند ہفتے بعد اچانک ادھی رات کو سوگوار مسز رائنڈر کو ایک کال موصول ہوا۔ آواز دھیمی اور پراسرار تھی ٹیلی فون کرنے والے نے اپنا نام نہیں بتایا اس نے کہا "مسز رائنڈر میرا نام اور پتا پوچھنے کی زحمت نہ کریں۔ خاموشی سے میری باتیں سنیں۔ جس روز آپ کو مسٹر ہیرالڈ رائنڈر کی موت کی اطلاع دی گئی، اس سے ایک روز قبل میں رائنڈر کے ساتھ ٹیکسی اسٹینڈ پر موجود تھا۔ اتنے میں ایک بڑی سی گاڑی اسٹینڈ کے قریب آکر رک گئی، اور اس میں سے تین افراد نیچے اتر کر ہماری طرف آئے۔ میں نے ان میں سے دو کو فوراً

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے

ٹورنٹو پولیس کی مجرمانہ

غفلت کا بھانڈہ پھوٹ گیا

پہنچان لیا۔ وہ پولیس سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ اس محکمے میں اکثر لوگ راشی اور جابر ہوتے ہیں۔ انہیں اس ڈھب سے تربیت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عوام سے علیحدہ تصور کرنے لگتے ہیں وہ لوگوں کی رہنمائی کرنے کے بجائے انہیں غلط راستے پر ڈالنے کا فرض پورا کرتے ہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ آپ چپ چاپ سنتی جائیں۔ وہ تینوں آدمی ہیرالڈ کے پاس آئے اور اسے ایک طرف لے جا کر دھیرے دھیرے باتیں کرتے رہے۔ وہ یقیناً اس سے اپنا وظیفہ مانگ رہے ہوں گے۔ ہیرالڈ ان سے گفتگو کرنے کے بعد جب اپنی ٹیکسی کے پاس پہنچا تو اس کا چہرہ زرد تھا۔ اور اس کے دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے اس نے مجھ سے اپنی کیفیت چھپانے کے لئے دونوں ہاتھ جیب کے اندر رکھ لئے۔ اور خوامخواہ سیٹی پر کوئی دھن بجانے لگا۔ میں نے جب اس سے پوچھا تو اس نے مجھے ٹال دیا۔ اور ٹیکسی لے کر چلا گیا۔ اسی دن شام کو ٹیکسی اسٹینڈ پر دوبارہ ملاقات ہوئی وہ بہت زیادہ نروس اور متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کچھ رقم طلب کی رقم اچھی خاصی تھی۔ جو میرے پاس نہیں تھی۔ میں نے معذرت کی، وہ پریشانی کے عالم میں دوبارہ کسی سواری کا انتظار کئے بغیر چلا گیا۔ دوسرے دن اخبارات اور آپ کے بیان کے ذریعہ مجھے اس کی گمشدگی اور موت کا علم ہوا۔ میں آپ کو بتا دوں میرا نام جاننے پر اصرار نہ کریں۔ میں آپ کے شوہر کا دوست اور بہی خواہ تھا۔ اگر میرے پاس اتنے روپے ہوتے تو ضرور دے دیتا۔ مگر افسوس میں اسی کی طرح قلاش تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ہیرالڈ پر آنے والی مصیبت اس کی جان لے کر ٹلے گی۔ اگر اس کا علم ہوتا اور اس المناک انجام کی خبر پہلے سے ہو جاتی تو شاید ہیرالڈ بچ جاتا۔ آپ غور سے سنئے آپ کے شوہر کی قبر میں دفن ہونے والا آدمی آپ کا شوہر نہیں ہے نقلی ہیرالڈ ہے۔ پولیس اور حکام نے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لئے ایک دوسرے شخص کو ہیرالڈ کے روپ میں پیش کر دیا۔ اصلی ہیرالڈ کہیں اور دفن کر دیا گیا۔ اگر آپ اس کا پتا چلانے میں کامیاب ہو گئیں تو اس کی لاش کے پوسٹ مارٹم سے ساری گتھی سلجھ جائے گی۔ اس کے جسم پر تشدد اور مار پیٹ کے نشان ہوں گے

مسٹر رائنڈر نے ٹیلی فون کی اس اطلاع کے بعد از سرِ نو تحقیقات کے لئے بھاگ دوڑ شروع کر دی اخبارات نے مسز رائنڈر کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے جائز مطالبہ کے سامنے پولیس اور حکام کو سر جھکانا پڑا۔ دونوں لاشوں کے دوبارہ پوسٹ مارٹم سے مسٹر ہیرالڈ رائنڈر کی پراسرار موت کی گتھی بالآخر سلجھ گئی۔ آدھی رات کو ٹیلی فون کرنے والے پراسرار آدمی کی کہانی سچی نکلی

برِصغیر کی تقسیم سے حبیب کی قسمت کُھل گئی

ادا شدہ سرمایہ کے حساب سے اسٹاک ایکس چینج کی فہرست کے مطابق حبیب گروپ کو پاکستان کی کاروباری دنیا میں چوتھا نمبر حاصل ہے۔ لیکن اگر (ASSETS) کی بنیاد پر جائزہ لیا جائے تو یہ گروپ داؤد، سہگل اور آدم جی کے مقابلے میں پہلے نمبر پر آتا ہے۔ آزادی سے پہلے حبیب بمبئی میں سونے کے تاجر تھے اور بہ پیشہ حبیب بنک کھولنے کے بعد بھی انہوں نے کافی عرصے تک جاری رکھا۔ حبیب بنک کھلتے ہی تمام مسلمان سرمایہ اس میں منتقل کرنے لگے۔ مسلمانانِ ہند کا یہ پہلا بنک تھا اور وہ ۱۵ سے ہندو اور انگریز بنکوں کے مقابلے میں ہر صورت کامیاب بنانے پر تل گئے۔

برصغیر کی تقسیم نے حبیب کی قسمت کھول دی۔ کروڑوں روپے کا سرمایہ جس کا کوئی دعویدار نہ تھا ان کی ملکیت بن گیا۔

اس وقت مندرجہ ذیل پانچ کمپنیاں حبیب کی ملکیت ہیں:

۱۔ حبیب بنک لمیٹڈ
۲۔ حبیب انشورنس
۳۔ حیدری کنسٹرکشن
۴۔ حبیب شوگر
۵۔ علی اصغر ٹیکسٹائل ملز

۱۹۶۲ء میں حبیب گروپ کے مجموعی (ASSETS) ۱۶۰ کروڑ تھے اور ۱۹۶۶ء میں (صرف چار سال بعد) یہ بڑھ کر ۷۰۴ کروڑ ہو گئے۔ (ذرا منافع کی شرح کا اندازہ لگائیے) اس کے مقابلے میں اسی سال سہگل کے (ASSETS) کی مجموعی قیمت ۳۰۱ کروڑ تھی۔ آدم جی کی ۱۶۹ کروڑ اور داؤد کی صرف ۴۶ کروڑ۔

۱۹۶۹ء میں حبیب گروپ کی کمپنیوں کا مجموعی ادا شدہ سرمایہ دس کروڑ تھا۔ اور اس حساب سے وہ چوتھے نمبر پر تھے۔ ۱۹۶۵ء میں یہ سرمایہ ۷ کروڑ تھا اور کاروباری دنیا میں ان کی چھٹی پوزیشن تھی۔ صرف سہگل، آدم جی، داؤد، کریسنٹ اور ویکا ان سے آگے تھے۔

وہ تین کمپنیاں جو ۱۹۵۴ء میں کراچی اسٹاک ایکس چینج کی فہرست پر آئیں ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ حبیب بنک
۲۔ حبیب انشورنس
۳۔ حیدری کنسٹرکشن

یہ تینوں کمپنیاں تقسیم ملک سے پہلے قائم ہو چکی تھیں۔ ۱۹۴۱ء میں حبیب بنک کھولا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں حبیب انشورنس اور ۱۹۴۴ء میں حیدری کنسٹرکشن کا نمبر آیا۔

۱۹۵۴ء تک ان کمپنیوں کا مجموعی سرمایہ تقریباً ۲ کروڑ تھا اور ۱۹۶۹ء میں یہ دس کروڑ تک پہنچ گیا۔

مندرجہ ذیل گوشوارے میں حبیب گروپ کی ترقی کی رفتار ظاہر کی گئی ہے۔

سال	مجموعی ادا شدہ سرمایہ (کروڑوں میں)
۱۹۵۵ء	۲،۱
۱۹۶۰ء	۳،۶
۱۹۶۵ء	۷،۲
۱۹۶۹ء	۱۰،۲

۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۵ء کے درمیان حبیب کے سرمایہ میں یک لخت اضافہ کی وجہ یہ تھی کہ انہیں حبیب بنک کے لئے نیا سرمایہ اکٹھا کرنے کا اجازت نامہ عطا ہوا۔ اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے صنعتی میدان میں بھی پاؤں پھیلانے شروع کر دیئے اس دوران انہوں نے حبیب شوگر مل قائم کی اور پھر اس کے فوراً بعد علی اصغر ٹیکسٹائل مل لگا کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

۱۹۵۴ء کے بعد ادا شدہ سرمایہ میں سال بہ سال اضافے کی رفتار ملاحظہ ہو:

سال	حبیب بنک	حبیب انشورنس	حبیب کنسٹرکشن	حبیب شوگر	علی اصغر ٹیکسٹائل مل	میزان
۱۹۵۴	۱۵۰	۵۰	۱۰	—	—	۲،۱۰
۱۹۵۵	۱۵۰	۵۰	۱۰	—	—	۲،۱۰
۱۹۵۶	۱۵۰	۵۰	۱۰	—	—	۲،۱۰
۱۹۵۷	۱۵۰	۵۰	۱۰	—	—	۲،۱۰
۱۹۵۸	۲۰۰	۵۰	۱۰		—	[illegible]
۱۹۵۹	۲۰۰	۵۰	۱۰	—	—	[illegible]
۱۹۶۰	۳۰۰	۵۰	۱۰	—	—	۳،۶۰
۱۹۶۱	۳۰۰	۵۰	۱۰	—	—	[illegible]
۱۹۶۲	۳۰۰	۵۰	۱۰	—	—	۳،۶۰
۱۹۶۳	۳۰۰	۵۰	۱۰	۱۵۰	—	۵،۱۰
۱۹۶۴	۵۰۰	۵۰	۱۰	۱۵۰	—	۵،۶۰
۱۹۶۵	۵۰۰	۵۰	۱۰	۱۶۰	—	۵،۲۰
۱۹۶۶	۵۰۰	۵۰	۱۰	۱۶۵	—	۷،۲۵
۱۹۶۷	۶۰۰	۵۰	۱۰	۱۷۵	—	۸،۳۵
۱۹۶۸	۶۰۰	۵۰	۱۰	۱۷۵	۸۵	۹،۲۰
۱۹۶۹	۷۰۰	۵۰	۱۰	۱۷۵	۸۵	۱۰،۲۰

۱۹۵۴ء میں ۲ کروڑ ——— ۱۹۵۹ء میں ۱۰ کروڑ

آئیے۔ اب انفرادی طور پر حبیب کی ان پانچ کمپنیوں کا جائزہ لیا جائے۔

حبیب بنک لمیٹڈ

حبیب بنک لمیٹڈ ۱۹۴۱ء میں بمبئی میں قائم کیا گیا۔ ۱۹۴۲ء میں اس بنک کی صرف دو شاخیں تھیں۔ آزادی کے فوراً بعد ۱۹۴۷ء میں یہ تعداد ۲۱ ہوگئی۔ پھر آزادی کی لازوال نعمتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ بنک ۵۰۲ شاخوں کا مالک بن بیٹھا۔ ان ۵۰۲ برانچوں میں دو غیر ملکی برانچیں (بمبئی اور کوالالم پور) بھی شامل تھیں۔ حبیب بنک (OVERSEAS) کی عدن، بیروت، برمنگم، بریڈ فورڈ، کولمبو، لندن، مانچسٹر، ممباسہ، پورٹ لوئی اور شارجہ کی شاخیں ان کے علاوہ تھیں۔ اور یہ پھیلاؤ ابھی جاری ہے۔ اب یعنی ۱۹۷۱ء میں کل برانچوں کی تعداد سات سو سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ ۱۹۶۶ء میں حبیب بنک کے ڈیپازٹ ۲۶۱ کروڑ کے قریب تھے۔ جبکہ ملک کے قومی بنک کے ڈیپازٹ صرف ۲۷ کروڑ تھے۔ اس بنک کا روپیہ حبیب کی انڈسٹریز کے کام آتا ہے۔ اور اس گروپ کی دولت میں مزید اضافے کا باعث بنتا ہے۔

حبیب انشورنس کمپنی

یہ کمپنی بھی ۱۹۴۱ء میں بمبئی ہی میں کھولی گئی لیکن اس کا رجسٹرڈ آفس تقسیم سے پہلے ہی کراچی منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت حبیب انشورنس ملک کی دوسری سب سے بڑی انشورنس کمپنی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں اس کمپنی کے پاس کوئی ۴۶۰۰۰ انشورنس پالیسیاں تھیں۔ جب کہ پاکستان کی سب سے بڑی کمپنی ایسٹرن فیڈرل کے پاس یہ تعداد تقریباً ۱۲۱۰۰۰ تھی۔

حیدری کنسٹرکشن

جب بنک اپنا ہو، انشورنس کمپنی اپنی ہو تو پھر سرمایہ دار سرمایہ لگانے کے لئے اور مزید منافع کمانے کے لئے دوسرے محفوظ ذرائع کی تلاش کرتا ہے۔ حبیب بنک اور انشورنس کمپنی کے بعد فوری طور پر حیدری کنسٹرکشن کی بنیاد رکھی گئی تاکہ اس بے پناہ سرمایہ سے بڑی سے بڑی بلڈنگیں بنا کر کرایہ کی صورت میں روپیہ بٹورا جائے۔ اس کی تازہ مثال حبیب پلازا ہے۔ منافع خوری کے لالچ میں صرف بلند و بالا عمارت ہی تعمیر کی گئیں حالانکہ چاہیئے یہ تھا کہ نچلے اور متوسط طبقے کی ضروریات کا خیال رکھا جاتا۔ لیکن ان دونوں طبقوں کا کوئی پرسان حال ہی نہیں۔ عوام مہنگائی کی چکی میں پس رہے ہیں اور اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ مکان کے کرائے کی صورت میں خرچ کر رہے ہیں اور ہمارا سرمایہ دار پلازوں کی تعمیر میں مصروف ہے۔

حبیب شوگر

حبیب گروپ کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں بنک اور انشورنس کمپنیاں نیشنلائز نہ کر لی جائیں۔ اس ڈر سے انہوں نے اپنے سرمائے کا رُخ زیادہ محفوظ صنعتوں کی طرف موڑ دیا۔ اور اس طرح حبیب شوگر مل کا قیام عمل میں آیا۔ اس مل نے ۱۹۶۴ء میں ۸۵۳۵۴ من، ۱۹۶۵ء میں ۲۸۲۹۷۷ من اور ۱۹۶۶ء میں ۷۴۸۴۵۷ من چینی تیار کی۔ ۱۹۶۶ء میں ایک عدد ڈسٹلری پلانٹ کا بھی اضافہ کر دیا گیا اور اس پراجیکٹ کے لئے روپیہ کہاں سے آیا؟ پاکستان انڈسٹریل کریڈٹ اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن سے دو غیر ملکی قرضے حاصل کئے گئے۔ ان میں سے ایک قرضہ ۲۱۸۶۲۰۰ فرانک کا حکومت فرانس سے دلایا گیا۔

علی اصغر ٹیکسٹائل مل

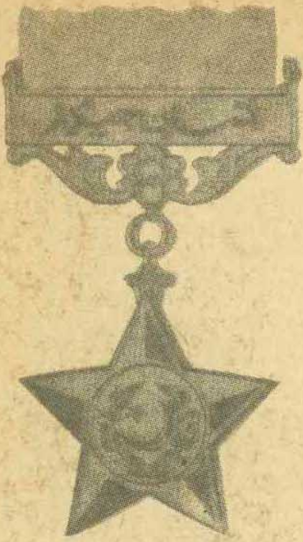
علی اصغر ٹیکسٹائل مل صنعتی میدان میں حبیب گروپ کا تازہ ترین کارنامہ ہے۔ ان پانچ کمپنیوں کے علاوہ حبیب انجینیئر کے نام سے ایک فرم حیدری کنسٹرکشن اور ایک اور فرم حبیب سنز کے نام سے حبیب شوگر ملز کے مینجنگ ایجنٹس کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ گھر کی دولت کسی صورت باہر نہیں جانے دی جاتی۔

۱۹۶۶ء میں علی اصغر ٹیکسٹائل ملز کے علاوہ حبیب خاندان کی چار کمپنیوں میں ڈائریکٹروں کی تعداد ۳۷ تھی۔ اس میں سے ۱۱ ڈائریکٹرشپس حبیب کے اپنے ہی خاندان میں تھیں۔

حبیب خاندان کے افراد	ڈائریکٹرشپس کی تعداد
۱۔ اسماعیل اے حبیب	۳
۲۔ حمید ڈی حبیب	۲
۳۔ احمد حبیب	۱
۴۔ یوسف اے حبیب	۱
۵۔ حیدر ایم حبیب	۱
۶۔ سلمان ایم حبیب	۱
۷۔ علی اصغر جی حبیب	۱
میزان	۱۱

باقی ڈائریکٹروں میں سے اکثریت حبیب خاندان کے پرانے نمک خواروں کی ہے۔ حبیب گروپ میں سب سے اہم شخصیت رشید ڈی حبیب کی ہے۔ دوسرے بڑے سرمایہ دار خاندانوں میں سے داؤد اور آدم جی حبیب گروپ میں ڈائریکٹروں کی حیثیت سے شامل ہیں۔ علاوہ ازیں داؤد خاندان اور باوانی گروپ نے حبیب بنک میں بے پناہ سرمایہ لگایا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ دوسرے سرمایہ دار گروپوں کی طرح ان کے اپنے ذاتی بنک نہ تھے۔

حبیب گروپ کی منافع خوری کا اندازہ صرف ایک مثال سے لگائیے۔ ۱۹۶۸ء میں اس گروپ نے اپنے شیئر ہولڈروں کو ۲۹ فی صد منافع تقسیم کیا۔ ۱۹۶۳ء میں کم از کم منافع تقسیم کیا گیا اور اس کی شرح بھی ۳ فیصد تھی۔



"نشانِ حیدر" "نشانِ پاکستان" سے بھی بلند تر کیوں ہے؟



"نشان حیدر" کا مرتبہ بلند کرنے کی تقریب کے سلسلے میں سابق کمانڈر انچیف جنرل محمد موسٰے خان کے انکشافات

نمائندہ الفتح

خانے آن قلات کے شاندار محل کے پیچھے جہاں سے پورا کراچی اپنی تمام تر عظمتوں سمیت اپنے قدموں میں دکھائی دیتا ہے۔ یہاں ایک زیر تعمیر بنگلہ ہے۔ سادہ مگر فراخ۔ جہاں مستریوں اور معماروں کے سر پر اس بنگلے کا مالک بھی ہر وقت کھڑا رہتا ہے۔ ڈھیلی ڈھالی بش شرٹ، سادہ سی اور کھلی پتلون پاؤں میں چپل، سر پہ چھوٹے چھوٹے بال اور ان کے درمیان سے نکلی ہوئی سیدھی مانگ، کشادہ پیشانی پنجاب کے میدانوں کی طرح۔ چہرے پر بڑھاپا جھریوں کی انفنٹری کے ساتھ حملہ کرتا ہوا۔ آنکھیں چھوٹی مگر بندوق کی نالی کی طرح شست لیتی ہوئی۔ الفاظ۔ گولی کی طرح بے تکلفانہ۔ بولنے میں مارچ پاسٹ کی سی رفتار۔ لہجے میں ایران جھلکتا ہے۔ سیاست اور ڈپلومیسی سے اتنے ہی دور۔ جتنے پرانے زمانے کے فوجی ہوتے تھے۔ جو دل میں آیا کہہ ڈالا۔ "ANYWAY وغیرہ وغیرہ SO WHAT" کے لفظوں پر ان کا کلام بار بار تکیہ کرتا ہے ریٹائرمنٹ کے بعد کوئی فرم چالو کی نہ کسی فرم کے چیئرمین بنے۔ اس خاموش گوشے میں خاموش زندگی گذارنے میں عافیت جانی۔ پاکستان میں ۲۲ سال سروس میں گذارے اور ایسے کہ ایک روز بھی رخصت نہیں لی، پاک فوج کی سپہ سالاری تو ۱۹۶۵ء کی شاندار جنگ پر انجام ہوئی تھی، لیکن مغربی پاکستان کی گورنری۔ کچھ بیوروکریسی کی سازشوں کچھ مرکزی حکومت کی ہدایات پر تعمیل کے باعث بخیر انجام نہ پاسکی۔ اور اچھی نیت اور اچھے ارادے بھی مقبول نہ ہوسکے۔ یہ بری فوج کے سابق کمانڈر انچیف اور مغربی پاکستان کے سابق گورنر محمد موسٰے خان ہیں۔ سمندر سے بہت نزدیک ڈیفنس سوسائٹی کے آخری کونے میں رہتے ہیں۔ شام کو سیر کے لئے نکلتے ہیں اور دن بھر مطالعہ کرتے ہیں، کتابوں، رسالوں اور اخبارات کا۔ ہیچ آفت نہ رسد گوشہ تنہائی را۔

"نشان پاکستان" سربراہان مملکت کو دیا جاتا

"نشان حیدر" ایک سپاہی کو بھی مل



کیپٹن سرور



میجر طفیل



میجر عزیز بھٹی

کیپٹن سرور شہید
میجر طفیل
میجر عزیز بھٹی
پائلٹ راشد منہاس

یہ چار نام - پاکستان کی تاریخ کے عظیم نام ہیں - ان ناموں سے پاکستان کا ہر دل عقیدت کے جذبات سے معمور ہوتا ہے - یہ وہ چار جانیں ہیں، جو وطن پر نثار ہو گئیں، ان شخصیتوں نے اپنی ماؤں کو سوگوار اپنے بیٹوں کو یتیم، اپنی بیویوں کو غمگین چھوڑ دیا تاکہ اور بہت سی مائیں سوگوار نہ ہوں، بیٹے یتیم نہ ہوں بیویاں بیوہ نہ ہوں۔ انہوں نے اپنی سب سے قیمتی متاع کی قربانی دی اور قوم نے انہیں عقیدت اور تشکر کے طور پر اپنا سب سے بڑا اعزاز دیا۔ نشان حیدرؒ جس کی عظمت پاکستان کے ہر اعزاز سے زیادہ ہے اس سے بھی جو سول اعزازات میں سب سے بلند ہے اور جو صرف پانچ زندہ شخصیتوں کے نصیب میں آتا ہے۔ جن کا رتبہ سربراہِ مملکت کے برابر ہوتا ہے۔ میری مراد "نشان پاکستان" سے ہے۔ اس اعلیٰ ترین اعزاز سے بھی زیادہ عظمت "نشانِ حیدرؒ" کو کیوں حاصل ہے -؟ یہ ایک سوال میرے ذہن میں گردش کرتا تھا۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں بھی گونجتا ہو۔ اسی تشنگی کو دور کرنے کے لئے میں نے پاکستان کی بری افواج کے سابق کمانڈر انچیف جنرل محمد موسیٰ خان سے ملاقات کی اور اسی مسئلے پر بالتفصیل گفتگو کی -

جنرل صاحب ۱۹۵۳ء میں اس میٹنگ میں شامل ہوئے تھے، جو انہی اعزازات کی حیثیت متعین کرنے کے لئے منعقد ہوئی تھی - اور وہ مسلح افواج کی نمائندگی کر رہے تھے۔

جنرل صاحب پہلے تو حال ہی میں نشان حیدر کا اعزاز پانے والے خوش نصیب راشد منہاس کو خراج عقیدت پیش کرنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ راشد منہاس شہید نے اپنی سب سے قیمتی متاع - یعنی جان عزیز وطن کی سلامتی پر نثار کر دی۔ اس کے تشکر کے طور پر وطن نے اپنا سب سے اعلیٰ اعزاز راشد منہاس شہید کے حضور پیش کر دیا۔ یہ اگرچہ اس قربانی کا ہرگز ہرگز بدل نہیں ہے، لیکن ہم ایسے جان نثاروں کے لئے اپنی طرف سے جو سب سے اعلیٰ نذرانہ پیش کر سکتے ہیں۔ وہ نشانِ حیدر ہی ہے -

جنرل صاحب بتانے لگے کہ نشانِ حیدر کے اعلیٰ ترین اعزاز کے لئے عظمت اور رتبہ جب متعین کیا گیا تو اس پر خاصی مفصل اور گرما گرم بحث ہوئی تھی -۔ یہ میٹنگ ۱۹۵۲ء میں کراچی میں ہی منعقد ہوئی تھی - اس وقت کے مرکزی حکومت کے چیف سیکرٹری سیکرٹری دفاع اور پروٹوکول کے افسران شریک ہوئے تھے -۔ اس لحاظ سے یہ ایک نہایت اعلےٰ سطحی اجلاس تھا کہ اس میں حکومت پاکستان کے مختلف محکموں کے سیکرٹری موجود تھے - میں اس وقت ڈپٹی چیف آف اسٹاف (بری افواج) تھا - میں نے مسلح افواج کی نمائندگی کی -

دوسرے تمام اعزازات کی حیثیت متعین کر لینے کے بعد جب بات اعلیٰ ترین سول اعزاز یعنی "نشان پاکستان" اور اعلیٰ ترین فوجی اعزاز یعنی "نشان حیدرؒ" پر پہنچی، تو مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ دونوں کی حیثیت ایک

اپنی سب سے قیمتی متاع — جان

قربان کر دینے والے کو قوم

اپنا سب سے بڑا

اعزاز کیوں نہ دے

ے جبکہ
سکتا ہے

سی ہو یا کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دی جائے۔ میں نے مخلصانہ طور پر تجویز پیش کی کہ نشانِ حیدر کی حیثیت۔ نشانِ پاکستان سے بلند تر رکھی جائے، اس پر سیکرٹری صاحب کو بہت تشویش ہوئی اور انہوں نے انتہائی تذبذب کے عالم میں کہا کہ ایک بار پھر سوچئے موسیٰ صاحب۔ فکر کی بات یہ ہے کہ نشان پاکستان کا رتبہ کچھ ایسا ہے کہ یہ عام طور پر غیر ملکی سربراہانِ مملکت کو دیا جاتا ہے اور وہ سربراہان مملکت۔ جن سے ہمارے تعلقات انتہائی دوستانہ مخلصانہ اور برادرانہ ہوتے ہیں۔ ان تعلقات اور خلوص کے اظہار کے طور پر پاکستان کی طرف سے



میجر عزیز بھٹی شہید نشان حیدر۔ ایک آرٹسٹ کی نظر میں

۶۵ء میں مرکزی سیکرٹری کو "نشانِ پاکستان" کی عظمت پر اصرار کیوں تھا؟

یہ اعزاز ان کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور پھر یہ صرف پانچ زندہ افراد کو دیا جاسکتا ہے۔ اس رتبے اور عظمت کے مقابلے میں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نشان حیدر کا ایک سپاہی بھی مستحق ہو سکتا ہے۔ ذرا سوچیں کہ نشان حیدر کو نشان پاکستان سے زیادہ حیثیت دینے سے نشانِ پاکستان کی حیثیت پر تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس پر خاصی گرما گرم بحث ہوئی۔ بعض اور سیکرٹری حضرات نے اس تذبذب کا اظہار کیا۔ ایک سیکرٹری صاحب نے کہا کہ اس طرح نشانِ حیدر کا اعزاز پانے والا "نشان پاکستان" کے اعزاز یافتہ سے زیادہ عزت کا مستحق ہو گا۔ کسی ایک تقریب میں یہ لوگ اکٹھے ہو گئے تو کچھ عجیب سی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔

جب یہ سب حضرات اپنے تذبذب کا اظہار کر چکے تو میں نے اپنے موقف کی وضاحت کی اجازت چاہی اور بتایا کہ یہ درست ہے کہ نشان حیدر ایک سپاہی کو بھی مل سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اعزاز وطن کی سلامتی کے لئے دشمن کے مقابلے میں انتہائی شجاعت کے کارنامے پر دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی سپاہی اس کے لئے اہل قرار پاتا ہے تو "Good Luck to him" یہ اس کی خوش قسمتی ہے

اس سے بڑا اور کیا مرتبہ ہو سکتا ہے یہ تو اعزاز کی تخصیص کرنے والوں کا فیصلہ ہوتا ہے، کیونکہ دشمن سے مقابلے کے بعد شجاعت کے کارنامے انجام دینے والوں کے بارے میں جو ایچ کیو میں Citations تعریفات آتی ہیں۔ جو افسروں، ساتھیوں اور سپاہیوں کے تاثرات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا جاتا ہے کہ کون کس اعزاز کا مستحق ہے — نشان حیدرؓ کا اعزاز۔ عام طور پر جس خوش نصیب کو ملتا ہے وہ اپنی متاع جان وطن پر نثار کر چکا ہوتا ہے۔ وہ دشمن کے مقابلے میں اپنے وطن کی حفاظت کے لئے اپنی سب سے قیمتی متاع جان قربان کر دیتا ہے۔ اب تک یہ اعزاز ایک شہید کو ملا ہے۔ شہادت کے بعد دیا گیا ہے۔ ویسے بھی یہ اعزاز اس خوش نصیب کے لواحقین کو ہی ملے گا۔ جہاں تک پہنچنے کا سوال ہے وہ خوش نصیب اسے قبر میں تو نہیں پہنے گا۔ انتہائی خوش نصیب ہو گا وہ شخص جو اس اعزاز کو پا لینے کا مستحق بھی ہو جائے اور زندہ بھی رہے ورنہ اس اعزاز کو پانے کے لئے اس خوش نصیب کو جان کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ اس سے اس نشان کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے"۔ میں نے بات ختم کی تو پھر گرما گرم بحث ہوئی



پائلٹ راشد منہاس

میرا موقف یہی تھا کہ جو شخص ملک کے لئے اپنی گراں ترین متاع قربان کر دیتا ہے۔ اس کے لئے ملک و ملت کو بھی اعلیٰ ترین خراج پیش کرنا چاہیئے فیصلہ یہ ہوا کہ یہ ساری رپورٹ تیار کر کے متعلقہ وزارتوں کو بھیج دی جائے اور وہ اس کے بارے میں فیصلہ کریں گی"۔

جنرل صاحب نے بتایا کہ کچھ دنوں بعد ایک تقریب میں ایک مرکزی وزیر ملے انہوں نے بتایا کہ میں نے اس میٹنگ کے سلسلے میں تمہارے دلائل پڑھے۔ جو انتہائی وزنی اور درست تھے، جب ایک شخص وطن کے لئے اپنی سب سے قیمتی متاع پیش کر دیتا ہے تو قوم کے تشکر کے جذبات کا اظہار بھی اعلیٰ ترین اعزاز کے ذریعے ہی ہونا چاہیئے۔ ہم نے آپ کی بات مان لی ہے۔ اور "نشان حیدر" کو "نشان پاکستان" سے بلند تر مقام حاصل ہو گا"۔

جنرل صاحب نے بتایا کہ یوں نشانِ حیدر ہمارے وطن کے سول اور فوجی اعزازات میں سب سے بلند رتبے کا حامل ہوا۔ جب میٹنگ ہوئی۔ اس وقت تک صرف ایک خوش نصیب اس کا مستحق قرار پایا تھا۔ اب تین اور خوش نصیب اس اعزاز کو حاصل کر گئے۔ انہوں نے وطن کی سلامتی پر آنچ نہیں آنے دی۔ اپنی جان بھی قربان کر دی۔ وطن کے ناموس کو بھی بچالیا۔ دوسرے خوش نصیب میجر طفیل تھے جنہیں کومیلا اگرتلہ کی سرحد پر بھارت کے مقابلے میں دلیرانہ اور شجاعانہ کارنامہ انجام دینے۔ اور وطن کی مقدس سرزمین کے ایک ایک انچ کی حفاظت کرتے ہوئے جان دینے پر یہ نشان دیا گیا تھا۔ ان کے لئے اس نشان کی سفارش اس وقت مشرقی پاکستان کے جی او سی جنرل امراؤ خان نے کی تھی ۱۹۶۵ء کی جنگ میں یوں تو ہر شہید نے لازوال قربانی دی لیکن میجر عزیز بھٹی نے انتہائی شجاعت کا وہ کارنامہ انجام دیا جس کے بعد وہ نشان حیدر کے مستحق قرار پائے۔ جنرل صاحب نے بتایا کہ میں میجر عزیز بھٹی صاحب کے صوبیدار سے ملنے ہسپتال میں گیا۔ وہ زخمی ہو گئے تھے۔ جب انہیں اطلاع دی گئی کہ میجر صاحب کو نشان حیدر دیا گیا ہے تو صوبیدار کہنے لگا کہ "وہ انسان نہیں تھا وہ تو کوئی عظیم طاقت تھا"۔ "میجر عزیز بھٹی کے لئے نشان حیدر کی سفارش میجر جنرل سرفراز خان نے کی تھی اور اب چوتھا خوش نصیب نوعمر پائلٹ راشد منہاس ہے۔ جس نے وطن کے وقار اور آبرو پر آنچ نہ آنے دی۔ ایک غدار کے ہاتھوں بے بس ہو کر دشمن کی سرزمین پر زندہ پہنچنے اور وطن کی عزت کو داغدار کرنے کی کے بجائے وطن کی سرزمین پر ہی جان جانِ آفرین کے سپرد کرنے اور غداری کے منصوبہ کو ناکام بنانے کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ جنرل صاحب نے خاص طور پر راشد منہاس شہید کی بہن رخسانہ منہاس کے کسی اخبار میں شائع شدہ انٹرویو میں سے اس بات کا خاص طور پر حوالہ دیا۔ کہ راشد کہا کرتا تھا کہ نشانِ حیدر پانا بڑا مشکل ہے۔ لیکن راشد نے یہ کتنی جلد حاصل کر لیا"۔

ضیاء سرحدی کی یادداشتیں — ۸



پہلی فلم آنے والی تھی

میرا دل دھڑک رہا تھا

ضیاء سرحدی میناکماری کو ہدایات دے رہے ہیں

ممتاز فلم ساز و ہدایتکار ضیاء سرحدی نے الفتح کے لئے لکھا

چند ماہ کی فلمسازی کے بعد میری پہلی طبعزاد کہانی من موہن جیسے جیسے ایام نمائش کے قریب پہنچنے لگی۔ ہزاروں وسوسے دن رات میرے سر پر منڈلانے لگے، اگرچہ شوٹنگ کے ایام ہی میں محبوب اور دوسرے متعلقہ لوگوں کے ساتھ تصویر کے RUSHPRINTS میں نے باقاعدگی کے ساتھ دیکھ رکھے تھے، تصویر کو ربط و تسلسل اور GRIP کے لحاظ سے بھی بار بار پرکھ لیا تھا، جزوی اور مجموعی اعتبار سے ہر منظر اور ہر باب کا جائزہ بھی کر لیا تھا، مگر اس کے باوجود میرا ذہن تصویر کی کامیابی اور پبلک کے رد عمل کے بارے میں خاصا ابر آلود رہا۔ آخری تدوین کے بعد فلم کا نمائشی پرنٹ نکلنے لگا۔ اور اس عرصہ میں بھی میری بے چینی کارفرما رہی اور میں لیبارٹری میں پرنٹ کو تمام مراحل سے گذرتے ہوتے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد فلم کا آخری پرائیویٹ شو ہوا اور اس شو میں، ساگر کا تمام اسٹاف موجود تھا۔ شو کے بعد اکثر لوگوں نے بڑے خلوص اور گرمجوشی کے ساتھ تصویر کے ہر متعلقہ فرد کو مبارک باد دی۔ اور تصویر کے چند پہلوؤں کی خاصی تعریف کی، بعض مکالموں کو کچھ لوگوں نے بے حد سراہا اور ایک یا دو اشتراکی رجحانات رکھنے والے افراد نے تصویر کے مدھم مدھم قسم کے SOCAO-ECONOMIC نقوش کو بھی بے حد پسند کیا۔ کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ تصویر میں PATHOS بقدر ضرورت ہے۔ اور کردار کا باہمی رشتہ مناسب حد تک نکھرا ہوا اور مضبوط ہے، کلائمیکس تصویر کی بنیادی گریمر کے اندر ہی سے اُبھر کے آتا ہے اور گانے بھی مقامی ہیں، غرضیکہ بھاری اکثریت کے ساتھ ساگر کے اسٹاف نے من موہن کو پسند کیا اور اس کی باکس آفس کی کامیابی کا یقین دلایا۔ لیکن ان تمام حوصلہ افزائیوں کے باوجود میرا ذہن سکون سے محروم رہا اور میں یہی محسوس کرتا رہا کہ جیسے میں آزمائش کے کسی خوفناک دار پر لٹکا ہوا ہوں اپنے طور پر ان ایام میں جب بھی میں نے تصویر کا جائزہ لیا، مجھے بار بار یہی یقین ہوا کہ تصویر میں صرف میرا کام ہی قابل نفرت ہے، اب نہ مجھے کہانی اچھی معلوم ہوئی، نہ مکالموں نے میرے دل کو کھینچا، نہ گیتوں میں مجھے کوئی روشنی کا پہلو نظر آیا۔ اور نہ ہی ایکٹر کی حیثیت سے ہی مجھے اپنا کردار قابل قبول معلوم ہوا، ایسے لمحے بھی آئے کہ مجھے اپنے ذہن اور اپنی صلاحیتوں پر شبہ ہونے لگا اور تصویر میں مجھ کو ہر دوسرے متعلقہ فرد کا کام اپنے کام سے ہزار درجہ بہتر معلوم ہوا، خاص طور پر فریدون ایرانی کی عکاسی میں مجھ کو غایت درجہ مختلف MOODS کی فراوانی کا احساس ہوا، فریدون کے مرتب کئے ہوئے LIGHT AND SHADE کا ڈرامہ میرے ذہن کے ہر گوشے سے پیوست ہو گیا۔ افلاس و ناداری کے ایام میں سرندر اور اس کے چھوٹے بھائی کے حالات کی PHOTOGRAPHIGBLENDING فریدون نے کچھ اس دیدہ وری اور رسائی فکر کے ساتھ کی تھی کہ اس کے چند SHOTS اور پھر ان کے DIMENSIONS اب بھی میرے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر سرندر کے چند CLOSE UPS اپنی ڈرامائی LIGHTING اور زاویوں کی تزئین کے لحاظ سے اب بھی نہیں بھلائے جا سکتے محبوب نے ایک یا دو جگہوں پر CROSS-ANGLES یا بالفاظ دیگر RUSSIAN-ANGLES کا استعمال اس تصویر میں کیا تھا۔ اور ایک یا دو مرتبہ جب یہ SHOTS آئے تھے تو مجھے ایسا معلوم ہوا تھا کہ فلم اپنی مرئی گریمر کے لحاظ سے کافی حد تک سنور گیا ہے۔ محبوب نے اداکاری کے خیال سے بھی اپنی پیش رو فلموں



پرانے دنوں کا ممتاز اداکار — سرندر

خوبصورت آنکھیں

میرے جذبات کو ابھار دیتی تھیں



دنیا، سہ حدی اور مینا کماری

کے مقابلے میں اس فلم میں اداکاروں کو بہت حد تک مبالغہ آمیز اور OVERACTING کی عام اور مروجہ ڈگر سے باز رکھا۔ اور اس فلم کی اداکاری میں مجموعی طور پر محبوب کی پچھلی فلموں کے مقابلے میں سنجیدگی اور بے ساختگی کا عنصر زیادہ محسوس ہوا، لیکن ان سب جزیات کے ہونے ہوتے بھی مجھ کو ادبی اور تحریری نکتہ نظر کے لحاظ سے من موہن بہت ہی بے اثر اور ڈھیلا ڈھالا فلم محسوس ہو تا رہا اور اس کے یکسر فلاپ ہو جانے کا یقین میرے دل کے اندر بڑھتا چلا گیا۔ نمائش کی گھڑیاں اب تیزی سے قریب آ رہی تھیں اور میرا سکوت اپنی سپیڈ سے کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ریلیز کے دو چار دن قبل، مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں INSOMNIA کا شکار ہو چکا ہوں اور نمائش کے بعد من موہن جب فلاپ ہو جائے گا تو یقینی طور پر میرے تمام خواب تمام امیدیں، تمام ولولے بجھ کر رہ جائیں گے۔ اور بھر جاتے کیا سے کیا ہو جائے گا۔

لیکن میرے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے اور "من موہن" کی جب نمائش شروع ہوئی تو لوگوں نے فلم کو بڑھ چڑھ کر پسند کیا اور چند ہی روز میں اخبارات نے اپنے تبصروں میں فلم کے حق میں اتنا لکھا کہ مجھے اس کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ جہاں تک میرے کام کا تعلق تھا۔ لوگوں نے نہ صرف کہانی بلکہ مکالموں کو بھی بہت پسند کیا اور خاص طور پر میرے لکھے ہوئے گیت۔ "تمہیں نے مجھ کو پریم سکھایا"۔ کو تو اس قدر اپنا لیا کہ نمائش کے چند ہی روز بعد گلی گلی اور کوچے کوچے میں ہر وقت یہ گیت گونجنے لگ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجھ کو ٹریڈ کے لوگوں نے کامیابی کے سنگھاسن پر بٹھا دیا۔ اور میں ایک کامیاب افسانہ نگار تسلیم کر لیا گیا۔ جگہ جگہ سے آفر آنے لگے اور میری مانگ اتنی بڑھ گئی کہ اس نے خود مجھ کو حیرت میں ڈال دیا۔ "من موہن" کی ریلیز سے پہلے اور اس کے بعد کا میرا یہ ردعمل اور میری یہ ذہنی کیفیت شاید صرف اسی وجہ سے تھی۔ کہ میں فطرتاً ہمیشہ سے اپنی ذات اور اپنے کام پر تنقید کرنے کا قائل رہا ہوں، اور کسی مرحلہ اور مقام پر میں نے اپنے کام کو بے عیب کبھی نہیں سمجھا۔ مجھ کو من موہن میں لاتعداد خامیاں نظر آنے لگیں؛ غیر ملکی فلموں کے علاوہ، میں نے ہندوستان کے صاحب فکر و باشعور فلمسازوں کی تصویریں دیکھ رکھی تھیں اور اپنی نوخیز فلمی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے ان کے مختلف روشن پہلو بھی میری نگاہ میں تھے، چنانچہ اب یہ تھا، کہ میں دن رات ان سنجیدہ اور فکر انگیز فلموں کی روشنی میں بار بار "من موہن" کو دیکھتا اور تولتا رہتا تھا۔ سکرپٹ کی باریکیوں سے میں اگرچہ پوری طرح واقف نہیں تھا مگر تاہم کچھ باتیں میری سمجھ میں ضرور آنے لگی تھیں، رفتہ رفتہ اب میں یہ جاننے لگا تھا۔ کہ فلم ایک مرئی فن ہے اور بنیادی طور پر اس کا رشتہ ہماری آنکھوں کے ساتھ ہے اور ہمارے ذہنوں یا روحوں کے ساتھ فلم کا جو سلسلۂ راز و نیاز ہونا چاہیئے وہ صرف دیکھنے کے SENSE کے ذریعہ ہی سے خوشتر ہو سکتا ہے۔ من موہن پر جب میں اس زاویئے سے غور کرتا۔ تو مجھے اس کے اکثر مکالمے غیر ضروری اور پیوند کی صورت میں نظر آتے خلا، وقت اور آنکھ فلمی دنیا میں آنے سے پہلے ہی میری زندگی کے بہت ہی اہم اور قابل غور مسائل تھے۔ خلاؤں کی وسعتیں وقت کا خاموش اور ان تھک سفر ہمیشہ سے مجھے مسحور کئے ہوئے تھے اور میں ان کی سحر طرازی کا پہلے ہی سے شکار تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ آنکھ میرے نزدیک انسانی جسم کا سب سے حسین اور پُر اثر حصہ تھی۔ میرے جذبات کو ہمیشہ آنکھ جس قدر ابھارتی تھی، اتنی کشش میرے نے اور کسی چیز میں نہیں ہوا کرتی تھی، آنکھوں میں بھی مجھ کو خلاؤں کی سی وسعت کا احساس ہوا کرتا تھا۔ بلکہ بسا اوقات مجھ کو حسین آنکھوں سے موسیقی برستی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میرے تمام معاشقے (جن کی تعداد بہت زیادہ رہی ہے) کسی نہ کسی کی آنکھوں سے ہی پھوٹتے رہے ہیں۔ انسانی جسم اور ساخت کی دوسری خوبیاں اور فطری نزاکتیں مقابلتاً بہت ہی کم مجھ پر اثر انداز ہوئی ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے محبوب کے ہونٹوں سے زیادہ اس کی آنکھوں پر اپنے نیاز مند بوسے نثار کئے ہیں بعض اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ آنکھ نے مجھے ناقابل بیان طور پر الجھا بھی دیا ہے؛ ہو سکتا ہے کہ آنکھوں سے میرا یہ ازلی رشتہ ہی میری فلم پسندی کا باعث ہوا ہو، اور فلم کا مرئی مزاج، میرے فلمی عشق کا سبب اسی لئے بنا ہو، کہ ہمیشہ سے آنکھوں کا پرستار رہا ہوں، اور ان پر اسرار چشموں میں ہمیشہ ڈوبتا رہا ہوں، بہر حال یہ تو میرے ذہن کے جھکاؤ تھے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ فلم کا رشتہ خلا، وقت اور نگاہ سے بہت ہی گہرا ہے اور میرے نزدیک یہ تینوں پہلو فلم کے غایت درجہ اہم اور ناگزیر پہلو ہیں، سیلولائڈ کا فریم خلا ہے اور جب وہ متحرک ہو کر محو سفر ہوتا ہے تو وقت کا راگ بن جاتا ہے اور پھر انسانی روح کے لئے آنکھ ان کی ترجمانی کرتی ہے۔

اسی اعتبار اور زاویۂ فکر کی وجہ سے میں شروع ہی سے بولتی فلموں سے کہیں زیادہ خاموش فلموں کا گرویدہ رہا ہوں۔ اور یہ بھی درست ہے کہ خاموش فلموں میں، فلم کے مرئی فن کی جو وضاحت اور JUSTIFICATION دیکھنے میں آئی ہیں وہ بولتی فلموں میں شاید ہی کبھی رونما ہوئی ہوں، اسی خیال کے پیش نظر انگلستان کے ایک سربرآوردہ فلمساز "پاول روتھا" نے شاید یہ کہا ہے اور طنز کے انداز میں کہا ہے کہ

SPOKEN WORD IS A LUXERY WHICH THE ART OF FILM CAN NOT AFFORD TO HAVE

یہ اور اس کے علاوہ فلم کے ہزاروں دوسرے پر اسرار پہلو ایسے ہیں کہ جو عرصہ دراز تک پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آسکے اور میں اپنی اس ناسمجھی کی وجہ سے ہمیشہ پریشان اور مضطرب رہا اور اسی سبب سے تمام کامیابیوں کے باوجود من موہن میرے نزدیک ایک بچگانہ اور ناپختہ فلم ثابت ہوا مگر لوگ اس کے چند جذباتی پہلوؤں سے متاثر ہو چکے تھے اور میرے کام کی تمام خامیوں کے باوجود مجھ کو کامیاب ماننے لگ گئے تھے۔ چنانچہ سروج موی ٹون کے مالک نانو بھائی ڈیسائی نے مجھے مالی اعتبار سے ایک بہت بڑا آفر دے دیا اور چند روز کے غور و فکر کے بعد میں نے اُس کے آفر کو قبول کر کے ساگر کو چھوڑ دیا۔ تاہم ساگر کے مالکان نے مجھ سے یہ وعدہ لیا کہ میں ساتھ ساتھ ان کے لئے بھی کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں گا۔

(باقی آئندہ)

تحریر:- یوری اولیشاہ ——— ترجمہ:- عبدالمبین خاں

انسانی ذہن کی تعمیرِ نو

میں گرامر اسکول کا ایک چھوٹا سا طالب علم ہوں میں جب جوانی کی حدود میں پہنچوں گا تو میں یقیناً مسٹر کوو الیفسکی جیسا بنوں گا۔ یہ میرے خاندان کے ہر فرد کی ایک دیرینہ آرزو ہے۔ ایک مطالبہ ہے۔

میں ایک انجینئر بنوں گا۔ اور بہت بڑی جائداد کا مالک بھی۔

بالکونی کا دروازہ پوری طرح کھلا ہے۔ جس میں سے بندرگاہ کے بے ہنگم شور کی آوازیں اندر سنائی دے رہی ہیں۔ بالکونی کے ایک کنارے پر ٹیاسے سے گملے میں ہرا پودا ہوا میں لہلہا رہا ہے۔ مسٹر کوو الیفسکی ہمارے ساتھ رات کا کھانا کھانے تشریف لا چکے ہیں وہ بالکونی کے دروازے کے سامنے کسی تصویری خاکے کی طرح کھڑے ہیں۔ اور ان کے دبلی پتلی سی ٹانگیں ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر زمین پر جمی ہوئی ہیں، ان کا وجود کسی گہرے سائے میں سمٹا ہوا نظر آ رہا ہے۔

میرے ابو ایکسائز افسر ہیں۔ غربت کی آگ میں تپتے ہوئے صاحبِ ظرف انسان اور تاش کے ایک بمنڈ کھلاڑی۔ ہم غریب ہیں لیکن اس جرم کے باوجود عزت دار ہیں۔ ابو اب بھی بے حد شریف النفس انسان ہیں۔ کوئی بھی شخص ان سے نفرت کا تصور اپنے ذہن کے کسی گوشے میں نہیں لا سکتا۔

میں ڈرائنگ روم میں مسٹر کوو الیفسکی کو خوش آمدید کہنے کے لئے جاتا ہوں۔ میں بہت کم سن ہوں۔ گول گول کندھوں والا اور بڑے بڑے کانوں والا۔ میں اندر جاتا ہوں۔ اپنے کانوں سے ہر آہٹ سنتا ہوا جیسے یہی کان میرے محافظ ہوں۔ ابو میرے پیچھے آتے ہیں۔ وہ میرے بارے میں تبلاتے ہیں۔ میں ایک عجیب و غریب اوصاف کا بچہ ہوں۔ غیر معمولی خوبیوں کا مالک۔ مہمان، مسٹر کوو الیفسکی، میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں، جو کہ مجھے کسی چوزے کی طرح دھبہ دار نظر آتا ہے

ابو جانتے ہیں خوشی اور مسرت کی کیفیت آگین وادیوں تک پہنچنے کے لئے زندگی کی کس راہ پر چلنا چاہیئے۔ خوشی مسرت و انبساط، سکون۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ امیر ہو، آزاد ہو اور معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہو۔ جیسے مسٹر کوو الیفسکی۔ ابو کو اپنی زندگی تاریکیوں میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ خالی خالی سی اور پُرہول سناٹوں سے لبریز۔ ہر غریب اور شریف انسان کی طرح ان کی بھی ایک سوچ ہے، ایک احساس

ہم غریب ہیں

اس کے باوجود

عزت دار ہیں

ہے۔ ذہین، کم درجہ اور دھتکارے ہوئے انسان کا احساس لیکن کسی ملال اور تاسف کی سلگتی ہوئی آنچ میں جلنا نادانی ہے، کیونکہ ساعتوں کا ہجوم سرپٹ دوڑتا کہیں دور نکل چکا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ صحیح ہو۔ لیکن ان کے ذہن میں ان تمام فاصلوں کا ایک خاکہ موجود ہے جو وہ طے کر چکے ہیں۔ ان کی اپنی زندگی کے اس خاکے سے قطع نظر ان کے ذہن کی اسکرین پر، مسٹر کوو الیفسکی کی زندگی کا کم و بیش حقیقی خاکہ موجود ہے ان خاکوں کا مشاہدہ زیادہ دشوار نہیں۔ ان دو مختلف خاکوں کا ایک دوسرے سے بآسانی موازنہ کیا جا سکتا ہے اور یہ موازنہ کیا بھی جا چکا ہے۔ دونوں کے درمیان مطابقتوں اور فرق کو معلوم کیا جا چکا ہے۔ تجزیہ کیا جا چکا ہے۔ ایک دوسرے کے برابر رکھ کر پہلو بہ پہلو ان دونوں کا مقابلہ کیا گیا تو ایک نئی زندگی کا خاکہ نتیجے کی صورت میں حاصل ہوا ایک تصوراتی اور کامیاب زندگی کا خاکہ۔ جو ابو بآسانی گذار سکتے تھے، اگر گردشِ ایام انہیں مسرتوں کے چمن میں سانس لینے کی اجازت دے دیتی۔

لیکن گذری ہوئی ساعتوں کو دوبارہ آواز نہیں دی جا سکتی اور نہ وہ لوٹ کر آ سکتی ہیں۔ پھر ایک نشاط انگیز اور مسرت خیز زندگی کے خاتمہ کا بوجھ ذہن پہ اٹھائے رکھنے سے کیا فائدہ؟۔ یہ خاکہ اپنے بیٹے کے حوالے کر دینا چاہیئے۔ اور اسی وجہ سے، میری رہنمائی کے لئے ابو کا تخلیق کیا ہوا خاکہ میرے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ وہ خاکہ جس کی بنیاد ناکامیوں اور رشکِ آرزوؤں اور تمناؤں کی اہمیت اور وہ قابلیت ہے جو صرف میرے ابو ہی کا سرمایہ ہے۔ یہ خاکہ مجھے اپنی انتہائی خوبصورت اور آخری شکل میں دیا گیا ہے اور مجھے اس پر بحث کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔

ابو کو اپنے اور مسٹر کوو الیفسکی کے درمیان فرق کی گہری خلیج کا احساس ہے۔ یہ ایک ایسی خلیج ہے جسے ابو کبھی پاٹ نہیں سکتے۔ لیکن جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوتا ہوں۔ ابو کی آواز سنائی دیتی ہے۔

اپنی ناکام زندگی کا خاکہ اپنے بیٹے کے حوالے کر دینا چاہیئے

"ووسیا اپنی جماعت میں اوّل نمبر پر ہے"۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ابو کی زندگی کے خلاء کی، جو بے چینیوں اور بے اطمینانیوں سے لبریز ہے، بے شمار دشواریوں میں سے ایک پر قابو پالیا ہے میں جماعت میں پہلے نمبر پر ہوں میں اپنے ہم جماعتوں سے بہت کم عمر ہوں لیکن ان سے کہیں زیادہ ہوشیار — یہ حقیقت بڑی اہمیت کی حامل ہے جسے مسٹر کوو الیفسکی کے نازک جذبات پر ضرور گراں گذرنا چاہیئے۔ میں بالکل بچہ ہوں۔ انتہائی کم عمر۔ لیکن بہت زیادہ محتاط حالانکہ میرے بدن میں خون کی بے حد کمی ہے۔ لیکن ابو کی توقعات پر پورا اترنے کی سعی کرنا میرا فرض ہے، وہ توقعات جو ابو نے مسٹر کوو الیفسکی سے مقابلے کے دوران مجھ سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ انہیں یہ یقیناً معلوم ہونا چاہیئے کہ مجھ میں وہ تمام خوبیاں اور خصوصیات موجود ہیں جو دنیا میں ترقی کرنے اور آرزوؤں کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں۔ ایک محتاط کردار، مستعد اور سرگرم — یہ وہ خوبیاں ہیں جو کامیابیوں کی ضمانت ہیں اور جو زندگی کی راہ میں روشن مشعلوں کا کام دیتی ہیں۔

درحقیقت مجھے ابو کی کامیاب زندگی کے پروگرام کی ایک ناگہانی اور اچانک اور قابل رشک ترمیم سے متعارف کیا گیا تھا — ایتھیا !۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے میں گرامر اسکول میں دوسری جماعت کا ایک طالب علم اور مسٹر کوو الیفسکی، انجنیئر صاحب جائداد اور کتی [illegible]نوں کے سرپرست، — !

میں اپنی آنکھیں اٹھاتا ہوں میری نظریں ایک داڑھی میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ داڑھی بڑی خوبصورتی سے تراشی گئی ہے۔ بڑی سی گھنی داڑھی جس میں گھونگھروں کے چھوٹے چھوٹے سے حلقے لٹکے ہوتے ہیں۔ اور ان کے نیچے، جنگل کی دیوی کی طرح کچھ تمغے سینے پر چمک رہے ہیں —

اب جب کہ میں اپنے اطراف میں دیکھتا ہوں تو مجھے کوئی داڑھی نظر نہیں آتی ترشی ہوئی داڑھیوں کو چہروں پر سجاتے لوگ کہیں دکھلائی نہیں دیتے !

ہم بھی گرامر اسکول کے بچے ہوا کرتے تھے۔ ہمارے والد تھے۔ دادا، چچا اور بڑے بھائی تھے انہوں نے درخشاں اور روشن مثالوں کی ایک گیلری قائم کی تھی ہمارے والدین ہمیں اس گیلری میں لے جاتے۔ اور مختلف سمتوں میں اشارے کرتے ہوئے۔ سرگوشی کے انداز میں ہمیں ہمارے چچاؤں، بھائیوں، رشتے داروں اور خاندان کے دوسرے دوستوں کے نام بتلاتے جاتے۔ جو ستاروں کی مانند جگمگا رہے ہوتے تھے۔

ہمارا بچپن باکمال اور صلاحیتوں سے بھرپور شخصیتوں کے سائے میں گذر گئے۔ انجنیئر، بنکوں کے منیجر، وکیل، کمپنیوں کے چیئرمین، صاحب جائیداد اور ڈاکٹر — ہمارا بچپن زندگی کی پگڈنڈیوں پر ان کے قدموں کے نقوش تلاش کرتے آن واحد میں گذر گیا۔

روس اور جاپان کی جنگ سپاہی ریابوف کے کارنامے، پہلی چلتی پھرتی فلم، لیوٹالڈا کا دو سو سالہ جشن فتح، یہودیوں کا قتل عام جنرل کالبارس ملکہ دریگا کا قتل یہ وہ واقعات تھے جو میرے بچپن کی سطح پر لافانی نقوش کی مانند چمٹ گئے تھے اور

میں بالکل بچہ ہوں،

انتہائی کم عمر،

لیکن بے حد محتاط

ان کے خلاف دوسری طرف وہ شخصیتیں تھیں جن کی صلاحیتیں عروج کی انتہائی بلندیوں کو چھو رہی تھیں سورج کی طرح روشن اور درخشاں مثالیں میرے ذہن کے نہاں خانوں میں سجے ہوئے داڑھیوں والے محبوب — داڑھیاں — داڑھیاں — داڑھیاں ...

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ان کے درمیان میں سرگرم عمل تھے۔ داڑھیاں رکھنے والے ان لوگوں کے ہونٹ سرخ سرخ تھے جن پر ہمیشہ مسکراہٹ پھیلی رہتی — بعض اوقات یہ ہونٹ مجھے جلی ہوئی سالن مچھلی کی طرح دکھلائی دیتے — پٹیوؤں کی طرح موٹے موٹے سے ہونٹ اسکولوں کی لڑکیوں کو اغوا کرنے والوں اور ان کی عصمت سے کھیلنے والے وحشیوں کی طرح کراہت آمیز۔

بعض داڑھیاں بھوری، لمبی اور نوکدار ہوا کرتی تھیں۔ تلوار کی طرح۔ ایسی داڑھیوں والے لوگوں کی بھنویں ہمیشہ سکڑی رہتیں اور بے شمار سلوٹیں گہری گہری تاریک نالیوں کی طرح پھیلی رہتیں — یہ لوگ پوری نسل کا ضمیر ہوا کرتے تھے۔

اور بعض چہروں پر چھوٹی لیکن پھیلی ہوئی گھنی داڑھیاں ہوتی تھیں۔ انہیں مٹھی میں پکڑا جا سکتا تھا — ریلوے کے افسروں اور جنرلوں کی داڑھیاں کچھ اس انداز کی ہوتی تھیں۔

میں مسٹر کوو الیفسکی کی طرح بنوں گا۔
میں بھی ایک داڑھی رکھوں گا۔

ہم دونوں یونیفارم پہنتے ہیں! — ایک گرامر اسکول کا طالب علم اور ایک افسر — ان کی یونیفارم کالی ہے جب کہ میری بھوری ہے۔

او! گرامر اسکول کے طالب کی بھوری یونیفارم! — تو مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی تھی میرا جسم، میرا وجود تیرے سخت کٹہرے میں مقید رہتا تھا تیرے کندھوں اور میرے کندھوں میں کوئی مطابقت نہیں تھی تو مجھ سے چمٹی رہتی تھی، وحشیانہ طور پر کسی کرسی کی غیر ہموار اور سخت پشت کی طرح — !

میں گرامر اسکول کا ایک چھوٹا سا طالب علم ہوں، ایسے کپڑے زیب تن کئے ہوئے جو کسی آہنی خود کی طرح تنگ نہیں ہیں۔ اور جن میں بچہ پروان چڑھ سکتا ہے۔ ہم دونوں یونیفارم پہنے ہوئے ہیں، مسٹر کوو الیفسکی اور میں — ہم ایک لمبی سی زنجیر کے دو حلقے ہیں ہم دونوں سینے پر بیج لگاتے ہیں اور فوجی اسٹائل کے کوٹ پہنتے ہیں، ہم دونوں اسکول کے ایک طالب علم اور ایک افسر کی جماعتی اور گروہی زندگی گذار رہے ہیں۔

"گڈ ایوننگ — "مسٹر کوو الیفسکی ؛ میں کہتا ہوں۔

"آہا —" مسٹر کوو الیفسکی حیرت سے کہتے ہیں "گڈ ایوننگ تم تو بہت خوبصورت اور پھرتیلے نظر آ رہے ہو"

کچھ توقف کے بعد ابو کہتے ہیں۔ ووسیا انجنیئر بننے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

اس لمحے میں فوراً ہی جواب دینا چاہیئے تھا کہ مستقبل میں ہونے والے انجنیئر ٹیکنیکل میں داخلہ لیا کرتے تھے۔ آپ نے مجھے گرامر اسکول میں داخلہ کیوں دلوایا؟ — لیکن میں چپ رہا۔

میرے لئے انجنیئر بننا ضروری ہے اور مجھے لاطینی زبان بھی آنی

اس مریض ذات کا گلا گھونٹنا ایک نیکی ہے

چاہیئے۔ بغیر اس زبان کو سیکھے کس طرح انجینئر بن سکتا ہوں۔؟ لیکن مجھ جیسے انجینئر کے لئے لاطینی زبان سیکھنا ضروری نہیں!۔۔۔ نہیں۔۔۔ تم چالاک بھی ہو اور ہوشیار بھی۔۔۔ تمہیں ہر چیز سیکھنی چاہیئے اور ہر کام کو۔۔۔ خواہ مشکل ہو یا آسان۔۔۔ کر گذرنے کا گُر تمہیں آنا چاہیئے۔۔۔ شکار کو گرفت میں لینا اور مدمقابل کو زیر کرنا تمہیں ضرور سیکھنا چاہیئے۔ تمام طلباء میں تمہیں سب سے زیادہ محنتی اور بااخلاق ہونا پڑے گا کیوں تمہارے ابو، تمہارے پیدا ہونے سے پیشتر ہی تاش کے پتوں پر اپنی تمام پونجی لٹا چکے ہیں۔ اور اب اسے دوبارہ جیتنا چاہتے ہیں۔

میری نام کشائی کے دن مجھے میکینکل ڈرائینگ کے آلات کا ایک سیٹ تحفتاً دیا گیا تھا۔

دو سیا کو ڈرائینگ سیکھنی چاہیئے۔

حالانکہ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ پرکار کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔

بہرحال، حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے، میں نے ڈرائینگ سیکھنا شروع کر دی، اور کاغذ پر لکیریں کھینچتے ہوئے، مجھے اپنی تخلیقی کاوشوں کی ایک چیخ ذہن میں لرزتی محسوس ہوئی، جو بالکل بے مقصد اور غیر اہم تھیں۔ کامیابی کی دولت سے کبھی مالا مال نہ ہونے والی آڑی ترچھی لکیریں۔۔۔ اس کی وجہ بیحد سادہ سی تھی میرے دماغ یا میرے شعور میں جہاں مستقبل کے ایک انجینئر کی سوچ کو موجود ہونا چاہیئے تھا۔ ایک خلا سا موجود تھا۔ پرہول اور وحشت انگیز خلا۔۔۔ میں کسی بھی چیز کو حرکت کی کیفیت میں رکھنے کو منطقی طور پر ناممکنات میں سے ایک سمجھتا جبکہ وہ چیز ابتداہی سے صفحۂ ہستی پر موجود ہی نہ ہوتی۔۔۔ اور یہ کیفیت، یہ سوچ، یہ آگاہی میرے جذبات کو کچل کر رکھ دیتے اور مجھے محسوس ہوتا کسی نے میرے سر پر پہاڑ لا کھڑے کئے ہوں؟۔

چمکتی ہوئی پرکاروں کا جوڑا مخملی غلاف میں بے جان سا پڑا رہتا اور اس کے دونوں بازو ایک دوسرے میں الجھے ہوئے۔

پرکار کا اوپری سرا عجیب موٹا سا بھدا سا ہے۔ میں اس کو اٹھاتا ہوں اور وہ اچانک کھل جاتی ہے اور میرے ہاتھ کو چھیل دیتی ہے اور پھر گرم گرم خون بہنے لگتا ہے۔ میں اس کے ایک بازو کو اپنی ایک مٹھی میں پکڑتا۔ لیکن وہ میرے ذہن سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ حرکت کرنے لگتا۔ ممکن ہے اس کی یہ حرکت میری کسی بھی حس سے زیادہ برق رفتار ہو۔۔۔ میں ہاتھ کے زخم کو منہ میں دبا لیتا ہوں لیکن اس سے پہلے کہ میری حس کسی خطرے کا سگنل دیں، پرکار تیزی سے میری مٹھی میں گھومتی ہے اور اس کی ایک تیز نوک سیدھی میری آنکھوں میں جھانکنے لگتی ہے۔ میں نہیں سمجھ پاتا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا ہے؟۔۔۔ یہ کیسی چمک ہے؟۔۔۔ یہ کیسی نوکیلی شئے ہے۔ جو طبعیاتی طور پر میرے لئے اجنبی ہے۔ ڈراونی اور بھیانک۔۔۔ جو موت کو اپنی پشت پر بٹھائے میرا تعاقب کر رہی ہے۔ اور میں خوف سے لرز رہا ہوں۔

میں اپنی مٹھی کھول دیتا ہوں۔ پرکار میز پر بالکل سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے۔ گویا وہ اپنے اطراف کے ماحول کا جائزہ لے رہی ہو۔۔۔ اب یہ چل رہی ہے۔۔۔ اب وہ رک گئی اور سر کے بل آگے کی سمت جھک گئی۔۔۔ اس کی دونوں ٹانگیں پھیل گئی ہیں دفعتاً میری دونوں آنکھیں ان پر جم کر رہ جاتی ہیں!۔۔۔

آج کل جب بھی میں اپنے گرد و پیش میں جھانکتا ہوں تو مجھے ہر طرف انجینئر نظر آتے ہیں۔

کوئی بھی صاحب جائیداد نہیں ہے۔۔۔۔ سب کے سب انجینئر۔

اور ان میں سے ایک میں، ادیب بھی ہوں۔

اور کوئی بھی مجھے انجینئر بننے پر مجبور نہیں کرتا۔ اور نہ مجھے مشورہ دیتا ہے۔

وہ مجھے انصاف کی لازوال اقدار کے بارے میں بتلاتے ہیں، وہ مجھے بتلاتے ہیں کہ عزت بہت بڑی نیکی ہے۔

پیوند لگا ہوا کوٹ بہت خوبصورت دکھلائی دیتا ہے سمور کے نوٹ کی طرح جاذب نظر۔

مجھے ہمیشہ انصاف پسند اور بااخلاق ہونا چاہیئے۔ اور غریبوں کو قابل نفریں نہیں سمجھنا چاہیئے۔ مجھے اپنے وجود کو ان اوصاف کے خول میں چھپانا پڑے گا۔ جب انقلاب برپا ہوا تو مجھے انسانی انصاف کے عظیم قانون اور عمل سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔۔۔ مظلوم عوام کی فتح۔۔۔ تب مجھے یہ احساس ہوا کہ پیوندوں میں چھپا ہوا کوٹ خوبصورت نہیں ہوتا اور نہ ہی عزت بہت بڑی نیکی ہے جسے انسان سینے سے لگائے رکھنے میں فخر محسوس کرے۔ اس لمحہ میرا شعور اس حقیقت سے آگاہ ہوا کہ صرف وہ کردار انصاف پسند ہیں جو غربت کی چکی میں پسے ہوتے اور ظلم کے تندور میں جھلسے ہوتے عوام کو منظم ہوتے میں مدد دیتے ہیں، وہ لوگ۔۔۔ مجھے زندگی کا درس دیتے تھکتے نہیں تھے، مجھ سے کبھی ایسے انصاف کے بارے میں ذرا بھی گفتگو نہیں کی۔ شاید وہ جانتے نہیں تھے یا اگر جانتے تھے۔ تو مجھ سے مصلحتاً" پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔ مجھے خود میں وہ لگن اور جستجو پیدا کرنا پڑی جس نے مجھے ان پردوں کے پیچھے جھانکنے پر مجبور کیا۔ جنہوں نے مجھ سے بے شمار حقیقتیں چھپا رکھی تھیں، مجھے تحت الشعور میں چھپی ہوئی ذہنی رسا کے ذریعے ان حقیقتوں کو پہچاننا پڑا۔۔۔ میرے ذہن میں کیا کچھ ٹھونسا گیا تھا۔؟ امارت کے خواب۔۔۔ تمام سوسائٹی کو اپنے قدموں کے آگے مسجود کر لینے کے خواب۔

مجھے اپنے آپ سے، اپنے وجود، اپنی ذات سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ مجھے اس نفس اور اُس شعور کا گلا گھونٹ دینا پڑے گا۔ جو ماضی کے دھندلکوں میں راہِ فرار ڈھونڈنا چاہتا ہے

وہ ذات جو ہمارے اور یورپ کے فاصلوں کو نشاندہی کرتی ہے، صرف جغرافیائی اہمیت رکھتی ہے، ورنہ انسانی رشتے فاصلوں پر نہیں بلکہ انسانیت پر قائم ہیں۔

وہ ذات جو یہ سمجھتی ہے کہ ہر ممکن چیز جو وقوع پذیر ہوتی ہے۔ صرف اسی تک محدود ہے، اس کی زندگی ہے۔ میری زندگی ہے۔ جو اپنے وجود کی تہوں میں چھپی ایک مسرت خیز زندگی گذارنے کی متمنی ہے، اس ذات کا گلا گھونٹنا ایک نیکی ہے۔ ایسی ذات میرے وجود میں موجود نہیں، کہیں میرے جسم کی چہار دیواری سے باہر موجود ہو تو ہو۔۔۔

میں ایسی خود غرض ذات کو کچل دینا چاہتا ہوں۔ اس جیسی دوسری تمام ذاتوں کو جو ماضی کی بدبودار اور غلیظ گلیوں میں رینگنا چاہتی ہیں۔

میں ان تمام کم ظرف، حقیر اور کم مایہ خواہشات کو ہمیشہ کے لئے زمین کی گہرائیوں میں دفن کر دینا چاہتا ہوں۔ جو میرے جسم کے ریشوں میں، میرے وجود میں اپنی غلاظت پھیلانا چاہتی ہیں۔

اگر میں عناصر کا انجینئر نہیں بن سکا تو کیا ہوا۔ میں انسانی نفس، انسانی ذہن کا انجینئر تو بن سکتا ہوں، کیا یہ سوچ۔۔۔ یہ فکر کسی خبطی کی بڑ نظر آتی ہے، مصنوعی ڈینگ؟۔۔۔ اگر ایسا ہے تو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں، میں کسی پاگل خبطی کی طرح چیختا ہوں "مرحبا۔۔۔ انسانی ذہن کی تعمیر نو۔۔۔ مرحبا۔۔۔ نئی دنیا کی قابل فخر انجینئرنگ۔۔۔ زندہ باد۔۔۔"

مرحبا

انسانی ذہن کی تعمیر نو

مرحبا

الفتح

بقیہ :— بازگشت

کو خط و کتابت، بالکل نہیں آنا چاہیئے۔ شاعر لاکھوں خط لکھے لیکن وہ ایک کا بھی جواب نہ دے۔ بلکہ اس کے خط کو اکثر پھاڑ دیا کرے کبھی کبھی وہی خط الٹا بھیج دیا کرے۔

(۱۶) — بعض ایسے بھی فرائض ہیں جو اسے اس صورت میں پورے کرنے ہوں گے جب شاعر محبوب کی زندگی میں فوت ہو جائے۔ پہلے تو یہ کہ اگر شاعر کو قتل کرنا ہو تو محبوب خود قتل کرے تاکہ وہ اس نظارے سے لطف اندوز ہو سکے۔ اگر شاعر طبعی موت مر رہا ہو — محبوب کو خواہ خبر بھی مل جائے تو بھی وہ اس کے پاس نہ آئے۔ کیونکہ وہ آسانی سے نہیں مر سکے گا بلکہ محبوب کو یہ خبر سن کر بہت دور چلے جانا چاہیئے تاکہ وہ تمام اشعار کام آ سکیں جو شاعر نے اس وقت کے لئے لکھے ہیں۔ مثلاً میں بیمار ہوں تم بہت دور ہو۔ اگر تم آجاؤ تو مجھ میں جان پڑ جائے۔ نزع کا عالم ہے اب تو چلے آؤ۔ پھر وہ طبیبوں سے بھی کہہ سکے "نادان حکیمو! یہ مرض عشق ہے۔ یہ لاعلاج ہے جاؤ چلے جاؤ میرا علاج تو محبوب کے زندگی بخش ہونٹوں کا لمس ہے" اس طرح جب وہ آہستہ آہستہ دم توڑ چکے تو وہ فوراً چلا آئے لیکن جب نمازِ جنازہ شروع ہو تو وہ وضو کرنے لگ جائے۔ ادھر کفن میں سے آواز آ رہی ہو گی مر رہے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے

اگر ہو سکے تو وہ اس وصیت کو بھی پوری کرے ؎

گلیوں میں میری لاش کو کھینچو پھیرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ راہ گزار تھا۔

اگر اس نے اسے قتل کیا ہو تو اسے اپنی گلی میں دفن نہ کرے۔ ہاں بھلا! اس مقتول کے واسطے لوگوں کو اس کے گھر کا پتہ کیوں چلے۔ یوں محبوب کی بہت بدنامی ہو جائے گی۔

جن امیدواروں کا جسم / ذہن / ادائیں / آواز معیار کے مطابق ہوں۔ جلد از جلد درج ذیل پتہ پر درخواستیں ارسال کریں۔ درخواست کے ساتھ بارہ تیرہ فوٹو گراف ضرور ہوں۔

پتہ — قالب جگری
۳۔ غزل روڈ۔ شعرستان



اے فطرت نامہرباں

لہلہاتے مسکراتے کھیت اُگلیں گے کہاں تک
بھوک کا آتش فشاں
تابہ کے فاقوں سے چٹخیں گی یونہی
محنت کشوں کی ہڈیاں

کارخانوں میں جلے گا کب تلک
بن کے چمنی کا دھواں
مزدوروں کا خون جواں
کب تلک مچلے گا سینوں میں
یہ دردِ بے اماں
کب تلک مظلوم انسانوں کی لاشوں پر
برہنہ رقص کا بھیانک سماں
سامراجی بھیڑیوں کے ظلم سے
کب تلک رہے گی آدمیت خونچکاں
کب تلک بہتی رہیں گی
ویت نامی سورماؤں کے لہو کی ندیاں
کب تلک اڑتی رہیں گی دہر میں
صدق و صفا کی دھجیاں
منصفی کر منصفی
اے فطرت نامہرباں

فارغ بخاری

گجرات

نوابزادہ صاحب تعلیم کے نام پر اپنا کاروبار چمکا رہے ہیں

وہ سوشل ورک کو سوشلزم کہتے ہیں

طارق جاوید چودھری

خطۂ گجرات جہاں میجر عزیز بھٹی شہید جیسے سپوت پیدا ہوئے. حکومت اور محکمہ تعلیم کی نظروں سے آج تک اوجھل ہے. یوں تو گجرات شہر میں کئی پرائیوٹ تعلیمی ادارے موجود ہیں مگر انہیں صرف کاروباری ادارے ہی کہا جا سکتا ہے کیونکہ کالج کی انتظامیہ طلبار کو تعلیم دینے کی بجائے ان کی جیبیں کاٹنے کی فکر میں لگی رہتی ہیں. ستم ظریفی کی حد ہے. غالباً پاکستان میں گجرات کی طرح کوئی ضلعی ہیڈ کوارٹر ایسا نہیں ہوگا. جہاں گورنمنٹ کالج موجود نہ ہو۔

گجرات میں تعلیمی اداروں کے سب سے بڑے اجارہ دار زمیندار ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کے سربراہ نوابزادہ اصغر علی ہیں انہوں نے کئی کاروباری دکانیں کھول رکھی ہیں. اور تعلیم کے نام پر عرصہ دراز سے روپیہ کما رہے ہیں. نوابزادہ صاحب قیوم لیگ کے ستون ہیں، ایوبی تحریک کے زمانے میں آپ نے ایوب خان کی حمایت میں جلوس نکالنے کی کوشش کی تھی جسے گجرات کے غیور عوام نے ناکام بنا دیا جلوس نوابزادہ صاحب کی کوٹھی کے ایک دروازہ سے نکلا اور دوسرے دروازہ سے اندر دھکیل دیا گیا. نوابزادہ صاحب ہمیشہ خاندانی روایات کے مطابق چڑھتے سورج کے پجاری رہے ہیں اور آج کل نظریۂ پاکستان کے سخت حامی ہیں. جبکہ تحریک پاکستان کے وقت یونینسٹ پارٹی کے حامی تھے

نوابزادہ اصغر علی جو چار تعلیمی اداروں کے سربراہ ہیں. ان کی علمی قابلیت کا اظہار پچھلے دنوں ایک پریس کانفرنس میں ہوا جس میں آپ نے ایک صحافی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "ہم نے کالج میں سوشلزم پڑھانے والا پروفیسر رکھا ہوا ہے جو باقاعدہ کلاس لگاتا ہے اور محکمہ تعلیم سے تنخواہ حاصل کرتا ہے" ہمارے لئے یہ بات بالکل نئی تھی. مزید استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ آپ سوشل ورک کو سوشلزم کہتے ہیں.

زمیندار ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کی دھاندلیوں کا انکشاف زمیندار ڈگری کالج کے ۱۹ سالہ پرانے پروفیسر سید حامد حسن، چوہدری فضل حسین اور عبدالحق اسلامیہ کالج ایسوسی ایشن کے صدر شیخ صدیق ظفر نے ایک پریس کانفرنس میں کیا. نوابزادہ اصغر علی نے انگلش ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ پروفیسر حامد حسن پر الزامات لگائے تھے کہ "وہ ۱۹ سال سے ان کے کالج میں پڑھاتے رہے ہیں مگر ہمیں آج علم ہوا ہے کہ ان کے پاس ایم اے کی ڈگری ۱۹۶۱ء ازی ہے اور یہی وجہ ہے کہ انگریزی کے نتائج بتدریج برے آ رہے ہیں" ایک دوسرے سینئر پروفیسر چوہدری فضل حسین کو جو کالج میں نفسیات کے واحد پروفیسر تھے اور ایم اے فارسی ہونے کے باعث فارسی کی کلاس بھی لیتے تھے. برطرف کر دیا گیا. ان پر الزامات لگاتے ہوئے کہا "وہ کالج کو ختم کرانے کی کوشش میں تھے (کیونکہ وہ پروفیسرز کے مطالبات کی حمایت کرتے ہیں) اور اب چونکہ فارسی میں طلبار کی تعداد بھی بہت کم ہے. لہٰذا انہیں برطرف کیا جاتا ہے"

نوابزادہ اصغر علی کے ان بے بنیاد اور لغو الزامات کا جواب دیتے ہوئے پروفیسر سید حامد حسین نے اخباری نمائندوں کو ایم اے انگلش، ایم اے اردو کی ڈگریاں دکھائیں. اور ثابت کیا کہ نوابزادہ صاحب کا یہ الزام کہ وہ ۱۹۶۱ء ازی ڈگری رکھتے ہیں قطعی غلط ہے انہوں نے کالج کے سالانہ نتائج کی رپورٹیں دکھائیں جو یونیورسٹی کے نتائج سے بہتر تھیں. اور انہیں باقاعدہ بہتر کارکردگی کے سرٹیفکیٹ ملے ہوئے تھے.

پروفیسر چوہدری فضل حسین نے بتایا کہ وہ اساتذہ کے حقوق کی خاطر جدوجہد جاری رکھیں. اور ان پر ایسی ہزاروں ملازمتیں قربان کر دیں گے، طلبار کی تعداد کے متعلق انہوں نے کہا کہ اس وقت فارسی پڑھنے والے طلبا کے علاوہ نفسیات میں طلبار کی تعداد ۵۰ کے قریب ہے جو آج کل کلاسوں کا بائیکاٹ کر رہے ہیں. اور وہ پڑھنے کے لئے ان کے پاس بار روم میں آتے ہیں؛

دراصل زمیندار ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کے سربراہ عرصہ دراز سے من مانی کر رہے ہیں. اور ذاتی مقاصد حاصل کر رہے ہیں مگر پچھلے دنوں جب سے حکومت نے گورننگ باڈیاں بنائی ہیں ان میں ایک پروفیسر حامد حسین بھی ہیں. ظاہر ہے ان کی موجودگی میں وہ دھاندلیاں نہیں کر سکتے، ان اساتذہ کو برطرف کرنے کی اصل وجہ بھی یہی ہے. وہ عوام کی توجہ ان دھاندلیوں سے ہٹانے کے لئے عوامی حلقوں میں دیانتدار، محنتی اور فاضل اساتذہ پر کیچڑ اُچھال رہے ہیں، زمیندار ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام اس وقت چار ادارے چل رہے ہیں. ان میں سے ایک زمیندار کالج ہے جس میں ہونے والی کچھ دھاندلیاں درج ذیل ہیں

زمیندار ڈگری کالج

گجرات میں ہونے والی دھاندلیاں

زمیندار ڈگری کالج کی عمارت تقریباً ۱۹۳۶ء میں ستر ہزار روپے کی لاگت سے تعمیر کی گئی جس میں سے ساٹھ ہزار روپیہ اس وقت کے ڈپٹی کمشنر جناب خورشید صاحب نے ریونیو بورڈ کی کسی مد سے کالج کی تعمیر کے لئے دلوایا تھا. کالج کا خورشید گیٹ اسی ڈپٹی کمشنر کی یادگار کے نام پر بنایا گیا تھا. اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً حکومت اور مخیر حضرات کی امداد سے اس کالج کے توسیعی وتعمیری کام تکمیل پاتے رہے، لہٰذا یہ کالج نوابزادہ اصغر علی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے، یہ عمارت قوم کی امانت ہے۔

نوابزادہ صاحب نے عمارت کا سالانہ کرایہ ۲ لاکھ ۱۳ ہزار

۶ سو روپیہ کا مطالبہ کیا ہے۔ جو سراسر غلط اور نامناسب ہے انہیں اس قومی ملکیت کا کرایہ حاصل کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں چند سال قبل کالج کو حکومت کی طرف سے شعبۂ سائنس کے لئے ۲۲ ہزار روپیہ کی گرانٹ ملی تھی جس میں سے صرف ۷ ہزار روپیہ خرچ ہوا ہے اور باقی پندرہ ہزار روپے کی تحقیقات ہو رہی ہے۔

کالج کی مرمت وغیرہ پر تقریباً تیس چالیس ہزار روپیہ سالانہ بتایا جاتا ہے، جو قطعی بوگس ہے دو سال پیشتر کنٹریکٹر نے یہ بوگس بل دینے سے انکار کر دیا تھا جس کے بعد نوابزادہ صاحب کے ہم زلف بشیر احمد سابق پولیس مین کو کنٹریکٹر ظاہر کر کے یہ بل بنوالیا گیا۔

گذشتہ دنوں ڈگری کالج کا ایک لاکھ بتیس ہزار روپیہ سائنس کالج کے لئے استعمال کیا گیا۔ اس طرح سے اس قومی ادارے کا ڈویلپمنٹ فنڈ ضائع کیا جا رہا ہے۔ کالج میں مسجد کی تعمیر کے لئے ۱۹۴۵ء سے متواتر مسجد فنڈ لیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کا کوئی باقاعدہ حساب کتاب نہیں رکھا جاتا۔ اور نہ ہی یہ فنڈ آج تک گورننگ باڈی کو منتقل کیا گیا ہے۔

کالج ڈسپنسری کے لئے جو کمرہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ وہ خورشید گیٹ کے نیچے واقع ہے اس کمرہ کی کل مالیت زیادہ سے زیادہ تین چار ہزار روپیہ ہوگی۔ ابتدا سے آج تک اس کمرہ کا کرایہ وصول کیا جاتا رہا۔ جو تقریباً ۱۲ ہزار روپے سالانہ ہے، اساتذہ کی رہائش کے لئے کالج میں کوارٹرز کی تعمیر کے لئے حکومت نے خطیر رقم دی تھی۔ ان کوارٹروں کی تعمیر ۱۹۶۵ء میں ہوئی۔ لیکن کالج کی انتظامیہ نے اساتذہ کی درخواستوں کے باوجود انہیں یہاں رہائش کی اجازت نہ دی، یہ کوارٹر ہمیشہ افسروں کے لئے مخصوص رکھے گئے۔ علاوہ ازیں کچھ دکانیں سرونٹس کوارٹر کے نام پر بنوائی گئی ہیں جو کرایہ پر چڑھا دی گئی ہیں۔ جن کا کوئی باقاعدہ حساب کتاب نہیں، کرایہ بجٹ میں شامل نہیں کیا جاتا نیز زمیندار ایجوکیشنل ایسوسی ایشن نے اسٹوڈنٹس فنڈ کا تقریباً ۔۔۔۔۷۶ روپیہ قرضہ ظاہر کر کے اپنے نام منتقل کر دیا۔

ڈسٹرکٹ کونسل کی طرف سے کالج کو دی جانے والی ۲۷ ہزار روپیہ سالانہ گرانٹ اور ۱۲ ہزار روپیہ بنک گرانٹ شاذ ہی کسی سال بجٹ میں شامل کی گئی ہو، بیشتر گرانٹ بجٹ میں شامل نہیں کی گئی۔

کالج اسٹاف میں سے بیلدار وغیرہ جو کہ کالج ہی کے ملازم ہیں اور اسی قومی ادارے سے تنخواہیں وصول کرتے ہیں۔ نوابزادہ صاحب کی زمینوں پر کام کرتے ہیں۔ گذشتہ انتخاب میں نوابزادہ قیوم لیگ کی طرف سے قومی اسمبلی کے امیدوار تھے۔ انہوں نے انتخابی سرگرمیوں کے دوران کالج اور ہوسٹل کا سامان، چارپائیاں اور فرنیچر بڑی فراخدلی سے استعمال کیا۔

گجرات کے طالب علموں اور سیاسی و سماجی حلقوں نے زمیندار ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کی ان دھاندلیوں کی پُرزور مذمت کی ہے۔ اور انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ فی الفور ان اداروں کو مفاد پرستوں کے چنگل سے آزاد کرائے اور اپنی تحویل میں لے۔

لاھور

ظفر اعوان صاحب! زمین دہقان کی ہے خان کی نہیں

محمد افضل جنجوعہ

"تنگی کی زمین خانوں پر تنگ ہو گئی ہے
چارسدہ میں مزارعین نے خوانین کو بٹائی اور اجارہ نہ دینے کا اعلان کر دیا ہے۔ انہوں نے زمینوں پر خانوں اور زمینداروں کا حق ملکیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے کسان جاگیرداروں کی زمینوں پر زبردستی قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ کسان بڑے ظالم ہیں ان کو ختم کر دیجئے۔ ان کو کچل ڈالیئے ہم مظلوم خوانین کو بچا لیجئے۔"

یہ ہے وہ واویلا جو سرحد کے خوانین نے اپنی لوٹ کھسوٹ اور مظلوم کسانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم پر پردہ ڈالنے کے لئے ملک بھر میں مچا رکھا ہے پاکستان بھر میں ان کے حواری اور تنخواہ دار ڈھنڈورچی مضامین، تقریروں اور بیانات کے ذریعے نظریہ پاکستان، ملکی سالمیت اور اسلام کے نام پر کھلے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں، اور پاکستانی عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔ سرحد کے خوانین اور جاگیردار اپنے گریبان میں جھانک کر خود ہی جواب دیں کہ کیا سالہا سال سے صوبہ سرحد کے مظلوم کسانوں کے استحصال کے لئے مندرجہ ذیل طریقے اختیار نہیں کئے گئے اور کسانوں پر جبر و تشدد کرتے وقت، اسلام، قانون اخلاقی ضابطے کا رتی بھر بھی خیال کیا گیا؟

"تورہ": سرحد کے خوانین، نواب اور جاگیردار اپنے مزارعین سے ان کی لڑکی کی شادی پہ پانچ روپے اور لڑکے کی شادی پہ دس روپے ٹیکس وصول کرتے ہیں اس ٹیکس کو "تورہ" کہا جاتا ہے۔ اگر لڑکا اور لڑکی ایک ہی گاؤں کے ہوں تو خان کو اپنے مزارعین کی خون پسینے کی کمائی سے پندرہ روپے مفت میں مل جاتے ہیں یہ غیر قانونی ٹیکس برسوں تک وصول کیا گیا

● "قلبیہ": قلبہ اس جاگیردارانہ اور غیر قانونی ٹیکس کا نام ہے جو مالیہ اور آبیانے کی رقم پہ بارہ آنے فی روپیہ کے حساب سے خوانین اپنے مہمانوں کی خاطر مدارات کے لئے وصول کرتے تھے۔ اگر کسی مزارع کے ذمے دس روپے مالیہ اور آبیانہ ہوتا تو اسے ساڑھے سات روپے قلبہ کے بھی ادا کرنے پڑتے کسانوں کے ننھے منے بچوں کو روٹی ملے یا نہ ملے لیکن خوانین کے مہمانوں کے لئے قلبہ ادا کرنا ضروری تھا، بھلا۔ غریب اور نادار" خوانین اپنے مہمانوں کی خاطر و مدارات کے لئے قلبہ نہ لیں تو مہمان نوازی کے اخراجات کہاں سے پورے کریں۔

● "ساتیسی" ساتیسی بھی دور غلامی کی یادگار ہے مزارعین کو باری باری خان کے گھوڑوں کو اپنے گھر میں رکھنا پڑتا تھا۔ گھوڑے کے کمزور یا بیمار ہو جانے کی صورت میں مزارعین سے جرمانہ وصول کیا جاتا اور اگر وہ گھوڑا مر جاتا تو اس کی منہ مانگی قیمت وصول کی جاتی تھی۔

● "خردھڑی" کے نام پر خوانین ہر فصل پر اپنے مزارعین سے $\frac{1}{2}$ ۵ سیر اناج فی گھرانہ گدھوں کے لئے وصول کرتے تھے۔ اگر کسی خان کے پاس گدھے نہ بھی ہوتے تب بھی مزارعین کو یہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا

یہ تو ہے ان ناجائز اور غیر قانونی ٹیکسوں کی داستان جو خوانین اور جاگیردار سالہا سال تک وصول کرتے رہے۔ اب سنئے۔ خوانین مزارعین کا مال کس طرح ہضم کرتے ہیں؟ ظلم و تشدد اور تنگ کرنے کے کیا طریقے اختیار کرتے ہیں؟

چینی کے کارخانے گنے اور چقندر کی فروخت کے لئے پرمٹ کسانوں کی بجائے خوانین کے نام جاری کرتے ہیں جس کے نام پرمٹ ہو رقم کی ادائیگی اسی کو کی جاتی ہے۔ کسان فصل تیار کرتے ہیں کاٹ کر ملز کے گیٹ تک پہنچاتے ہیں لیکن اس مال کی قیمت کی ادائیگی خان کو کی جاتی ہے خان صاحب قیمت وصول کر کے جیب میں رکھ لیتے ہیں مظلوم کسان خان

کے محل کا طواف کرتے رہتے ہیں لیکن خان تک رسائی نہیں ہو پاتی اگر کہیں بھول کر ملاقات ہو بھی جائے تو خان یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ "ابھی تک تو ایک پائی بھی ملز سے وصول نہیں ہوئی جب پیسے مل جائیں گے تو تم سے بھی حساب کتاب کر لیا جائے گا۔ اطمینان رکھو مرے کیوں جاتے ہو"

خوانین اجارہ اور بٹائی وصول کرنے کے باوجود رسید نہیں دیتے اگر شامت کا مارا کوئی مزارع رسید مانگنے کی "جسارت" کرے تو یہ سب سے بڑی گستاخی سمجھی جاتی ہے اس گستاخی پر خان کے پالتو غنڈے مناسب سزا دینا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں ملک کے قانون کے مطابق مزارع اجارہ یا بٹائی ادا نہ کرے تو اسے بے دخل کیا جا سکتا ہے اور بٹائی کی ادائیگی کے ثبوت کے لئے رسید نہایت ضروری ہے۔ خوانین رسید اس لئے نہیں دیتے کہ مزارع کو بے دخل کرنے میں آسانی رہے۔ ذاتی استعمال کے لئے حسب ضرورت کچی فصل کاٹ لینا خوانین اپنا حق سمجھتے ہیں اپنے خون پسینے سے فصل کو پروان چڑھانے والے کسان کو اتنا بھی حق حاصل نہیں کہ وہ چوں بھی کر سکے۔ اگر کوئی اعتراض کرتا ہے تو اسے جھوٹے مقدموں میں الجھا دیا جاتا ہے یا خان کے تنخواہ دار غنڈے اس کی خاطر خواہ مرمت کر دیتے ہیں۔

خوانین اپنی تھوڑی سی زمین کسانوں سے اجارہ یا بٹائی پر کاشت کرواتے ہیں باقی زمین پر کسانوں کو بلا معاوضہ کاشت کرنی پڑتی ہے جس کا کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا اس کے علاوہ خان کی عورتوں کو ڈولیوں میں بٹھا کر لانا لیجانا، خان کے لئے خشک لکڑیاں ایندھن کے لئے مہیا کرنا ان کے حجرے یا محل کی صفائی، نگہداشت باغات اور پھولوں کی دیکھ بھال کرنا، خان کے خاندان کے لئے خالص شہد جمع کرنا خان صاحب کے ہاتھ پاؤں دبانا اور سر پر روغن بادام کی مالش کرنا بھی کسانوں کے فرائض میں داخل ہے کسانوں سے بیگار لینے کے علاوہ کسانوں کی بہو بیٹیوں اور عورتوں سے بھی بیگار لی جاتی ہے انہیں خانوں کے حجروں میں بلا معاوضہ کام کرنا پڑتا ہے اگر خان کے ہاں کوئی مہمان آ جائے تو بلا معاوضہ مرغیاں مہیا کرنا مزارعین کا فرض سمجھا جاتا ہے۔ بعض مدتوں میں ہر مزارع کو سال میں باقاعدہ دو مرتبہ بڑی سی مرغی خان کی نذر کرنا پڑتی ہے اکثر جگہوں پر چرواہے اور گوجر کو ہر سال ایک موٹا تازہ دنبہ بطور نذرانہ خان کو پیش کرنا پڑتا ہے۔

صوبہ سرحد کے خوانین اور جاگیردار کسی غلطی پر مزارع پر جرمانہ کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں خوانین اپنے حجروں میں باقاعدہ عدالتیں لگاتے ہیں۔ جہاں کسانوں کو سزائیں دی جاتی ہیں۔ خوانین کے علاوہ مزارعین کو خان کے مقرر کردہ مختار کار اور ناظر کو بھی خوش رکھنے کے لئے گھی، مرغی، شہد اور غلہ دینا پڑتا ہے ورنہ وہ خان سے شکایت کر کے مزارع کو مصیبت میں ڈال سکتا ہے۔

غرض کسانوں پر خانوں کے جبر و ظلم کی فہرست بہت لمبی ہے کسانوں نے نہ تو زمینوں پر خانوں کی ملکیت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے اور نہ ہی وہ اجارہ یا بٹائی کی ادائیگی سے منکر ہیں دراصل خان کسان کو بے دخل کر کے اپنی زمینوں کو ٹریکٹروں کے ذریعے خود کاشت فارموں میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں تاکہ دولت کے اور بھی زیادہ انبار لگائے جا سکیں۔ لاکھوں مزارعین اور ان کے بچوں کی روٹی کا انحصار انہی زمینوں پر ہے خوانین کو اس کا قطعاً احساس نہیں کہ ان کی جلب زر کی خواہش ملک کے لاتعداد انسانوں کو بے روزگار بنا کر وطن عزیز کے لئے ایک بہت بڑا مسئلہ کھڑا کر دے گی حقیقت میں یہ بھیڑیئے اور بکری کے بچے کی کہانی والی بات ہے خوانین کسی نہ کسی بہانے مزارعین کو بے دخل کر کے اپنی خود غرضانہ خواہشات کی تکمیل چاہتے ہیں۔ کسانوں کا "جرم" یہ ہے کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے متحد ہو چکے ہیں اور خانوں کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے لگے ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں پاکستان کے عوام خود ہی فیصلہ کریں کہ سرحد کے جابر خانوں کے ظلم و جبر کا خاتمہ ہونا چاہیئے یا ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والے کسانوں کا خاتمہ ضروری ہے؟

موت اور زندگی کی اس کش مکش پر مسٹر ظفر اعوان کو بھی غور کرنا چاہیئے موصوف نے ہفت روزہ "زندگی" کے ۲۵ تا ۲۹ جولائی کے شمارے میں "تنگی کی زمین خانوں پر تنگ ہو گئی" کے عنوان سے مضمون لکھ کر حکومت وقت کو یہ قیمتی اور مفید مشورہ بالکل مفت دیا ہے کہ "ان لوگوں کا خاتمہ ہونا چاہیئے" سبحان اللہ قربان جایئے تنخواہ دار ادیبوں کی انشاء پردازی کے

کنری

صاحبو! خدا کا شکر ہے کہ دو سال سے جھنڈا صحیح لہرایا جا رہا ہے

غازی مختار

ریڈیو پاکستان اور ملک کے اخبارات کو دیکھتے ہوئے ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ واقعی ۶ ستمبر کو یوم دفاع تھا اور بڑے دھوم دھام سے منایا گیا البتہ کنری شہر ہی شاید پاکستان کا واحد شہر ہے جہاں قومی دن کوئی وقعت نہیں رکھتے، پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا دن ۱۴ اگست ہے مگر ۱۴ اگست کو بھی کنری ٹاؤن کمیٹی اور چند دوسری عمارتوں پر جھنڈا لہرانے کے علاوہ کوئی ایسی تقریب نہیں ہوئی جس سے لوگ سمجھتے کہ آج ۱۴ اگست ہے۔ صاحبو! خدا کا شکر ہے کہ دو سال سے جھنڈا صحیح لہرایا جا رہا ہے ورنہ ۶۹ء کے ۱۴ اگست کو جب ہم نے ٹاؤن کمیٹی آفس پر لہرانے والے جھنڈے کو دیکھا تو حیران رہ گئے کہ یہاں کے "محب وطن بھائیوں" نے جھنڈا الٹا لگا رکھا تھا یعنی چاند ستارے کا رخ بجائے آسمان کے زمین کی طرف تھا ہم اس "وطن دوستی" پر تلملا کر بھاگے ہوئے چیئرمین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے جھنڈا سیدھا کرانے کی درخواست کی تو چیئرمین صاحب نے ہمیں اوپر سے نیچے تک بڑے غور سے دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔ تم صحافی ہو ورنہ کچا چبا جاتا۔ پھر نفرت سے منہ پھیرتے ہوئے، گویا ہوئے۔ "الٹا ہے تو کیا ہوا دس سال سے ایسے ہی جھنگا چلا آ رہا ہے۔ تم کنری میں ابھی نئے آئے ہو" ہمیں اس انکشاف پر غصہ تو بہت آیا۔ مگر دو چار کھری کھری سنانے کے سوا کیا کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ پولیس تھانہ پر بھی جھنڈے کی بجائے ایک مٹیالے رنگ کا چیتھڑا لہرا رہا تھا۔ شاید کبھی جھنڈا رہا ہوگا۔

خیر صاحب یہ تو ہم پرانے دکھ لے بیٹھے، ہمارا خیال تھا چیئرمینوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ مگر اس دفعہ ۱۴ اگست کو بھی وہی کچھ ہوا جو ہم دو سال سے دیکھتے چلے آ رہے تھے یعنی کچھ بھی نہیں ہوا، فرق صرف یہ تھا کہ اس مرتبہ جھنڈا سیدھا تھا۔

۱۴ اگست گذرا ۶ ستمبر قریب آیا۔ بڑے زوروں سے ۶ ستمبر کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ طلبا کی یہاں دو فیڈریشنیں ہیں جن کے لمبے چوڑے پروگرام تھے۔ اسکول میں مباحثے، تقریریں،

ڈرامے اور جانے کیا کچھ ہونے والا تھا۔ مگر ۵ ستمبر کو معلوم ہوا کہ کوئی پروگرام نہیں ہو گا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے بتایا ہے کہ گورنر صاحب کا حکم ہے کہ کوئی جلسہ، جلوس وغیرہ نہیں ہو گا۔ جہاں تک سیاسی پارٹیوں کا تعلق ہے ہم نے ۱۴ اگست کو ایک پارٹی کے لیڈر سے دریافت کیا کہ آپ کا آج کوئی پروگرام کیوں نہیں؟ تو انہوں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں آنکھیں سکیڑتے ہوئے ہاتھ لہرا کر ہمیں سمجھایا کہ "۱۴ اگست کا مطلب یہ نہیں کہ جلسے جلوس وغیرہ ہوں۔ ہم نمائش کی بجائے تعمیر کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ ملکی سالمیت کے لئے جستجو کرنا ہمارا آج کا پروگرام ہے۔" یہ کہہ کر موصوف اپنے پارٹی آفس میں جا کر ایک آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔ سگریٹیں پھونک کر اور اونگھ کر انہوں نے ۱۴ اگست کے دن تعمیری کام انجام دیئے جن پر ملکی سالمیت کا دارومدار ہے۔

چھ ستمبر کو صبح ہی ہم اسکول پہنچے اسکاوٹس نے جھنڈے کو سلامی دی، مولانا نے شہیدوں کے لئے دعا کی اور پروگرام ختم ہو گیا۔ ایک صاحب نے بڑے دکھ سے کہا "شہیدوں کا خون تو نوکر شاہی، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور مفاد پرست سیاست دانوں نے کب کا بیچ کر پورا کیا۔ اب رہ کیا گیا ہے جس کے لئے ۱۴ اگست یا ۶ ستمبر منائیں"۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو تلاش کیا تو پتہ چلا کہ وہ میرپور خاص چلے گئے ہیں۔ ایک ماسٹر صاحب سے معلوم ہوا کہ "ٹاؤن کمیٹی نے سب پروگراموں کے لئے سختی سے منع کر دیا تھا۔ ورنہ ہم لوگوں کے تو بہت پروگرام بنائے تھے ہمیں صرف جھنڈا لہرانے اور دعا کرنے کی اجازت ہے، جو ہم کر چکے ہیں"۔

ہم نے بعض لوگوں سے سنا ہے کہ سیکرٹری ایڈمنسٹریٹر صاحب کے نزدیک ایسے فضول دن منانا روپیہ اور وقت برباد کرنے کے مترادف ہے۔

کراچی

مزدور رہنما ریاض حسین

سب سے طویل سزا بھگت رہے ہیں



الفتح رپورٹ

پاکستان میں یہ بڑی عجیب رسم ہے کہ سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں یا کارکنوں کی گرفتاری یا ایک دن کی بھی سزا پر اخبارات ان کی بڑی بڑی تصاویر شائع کرتے ہیں چار چار چھ چھ کالمی خبریں چھپتی ہیں نام نہاد قربانیوں کا ذکر کیا جاتا ہے حصول اقتدار کی جدوجہد کو عوامی جدوجہد کا نام دیتے ہیں رپورٹر حضرات بھاگم بھاگ کر کے ان کے حالات زندگی معلوم کرتے ہیں گھر والوں اور دوست احباب کے تاثرات معلوم کرتے ہیں، کالم نویس اپنی انشا پردازی کے جوہر دکھاتے ہیں، اخبارات طوائفوں اور اخلاقی مجرموں کی بھی تصویریں اور خبریں شائع کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے۔ لیکن محنت کش طبقہ کو ان نام نہاد قومی اخبارات میں جگہ نہیں ملتی۔ مزدور اور کسان رہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاری یا سزا پر خبریں شائع ہوتی ہیں اور نہ کوئی تصویر۔ حالانکہ محنت کش طبقے کی بدولت ہی یہ دنیا قائم ہے انسانی زندگی اور ترقی کا دارومدار اسی طبقے کی وجہ سے ہے۔ اگر مزدور مشین کا پہیہ چلانا بند کر دے کسان ہل چلانا چھوڑ دے تو انسان کا وجود ہی مٹ جائے۔

مزدور رہنما ریاض حسین کراچی سنٹرل جیل میں پانچ سال قید بامشقت کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ ابھی تک جن مزدوروں کو سزا دی گئی ہے ان میں سب سے طویل سزا ریاض حسین کو ملی ہے ۲۵ سالہ ریاض حسین داؤد کاٹن ملز کا مزدور ہے ۵ مارچ ۱۹۷۰ء کو داؤد ملز کے مزدوروں نے اپنے حقوق کے حصول کے لئے ہڑتال کی ریاض حسین نے شب و روز مزدوروں میں کام کر کے ان کے حوصلوں کو بلند رکھا۔ لیکن یہی مزدور دوستی اس کے لئے "جرم" بن گئی۔ داؤد کے نزدیک وہ خطرناک ترین آدمی بن گیا چنانچہ ۲۱ اپریل ۱۹۷۰ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ تقریباً پانچ ماہ تک بغیر مقدمہ چلائے جیل میں رکھا گیا اور پھر مختلف دفعات کے تحت اسے سزائیں سنائی گئیں۔ اسے مجموعی طور پر پانچ سال قید بامشقت کی سزا ملی ہے جو مغربی پاکستان کے مزدور رہنماؤں کو ملنے والی سزاؤں میں سب سے زیادہ طویل ہے

ریاض حسین آج بھی جیل کی سلاخوں کے اس پار بیٹھا ہوا اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہے۔ کیونکہ مزدور دوستی اس کا ایمان اور عقیدہ ہے۔

ٹرین کے سفر نے طلائی تمغہ حاصل نہ ہونے دیا

باکسنگ کی ٹیم • ایران سے سر جھکائے واپس آگئی

لطافت علی صدیقی

ابھی برطانیہ میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کی ناگہانی 'ہار' کا زخم ہرا ہی تھا کہ ایک دوسری پاکستانی ٹیم غیر ملکی دورے سے سر جھکائے واپس پہنچ گئی۔ یہ ہماری باکسنگ کی ٹیم ہے جو تہران گئی تھی۔ وہاں اس کے حصے میں ایک طلائی تمغہ بھی نہ آیا۔ البتہ واپسی میں بودی دلیلیں اور عذر لنگ کا پٹارہ ساتھ لائی۔ یہ ہمارے یہاں تیز اثر والی خاصی پرانی روایت ہے۔ شکست کی جو وجوہ بیان کی گئی ہیں ان میں :

الف - ٹرین کے تھکا دینے والے سفر سے ہمارے کھلاڑی اس قدر تھک گئے تھے کہ وہ ایک بھی طلائی تمغہ حاصل نہ کر سکیں۔

(ب) مقابلے کے ریفری اور جج صاحبان خاصے تعصب کے شکار نکلے (اس عذر پر ذرا غور کریں۔ یہ الزام ان ایرانی بھائیوں پر عائد کیا گیا ہے جو ہم سے بہت زیادہ قریب ہیں)

اپنی شکست کی جھینپ مٹانے کے لئے الزام تراشی کی یہ روایت ہمارے ملک میں اچھی خاصی 'مقبول' بن چکی ہے۔ غیر ملکی دوروں میں ہماری ٹیم جب کبھی شکست سے دوچار ہوئی۔ ٹیم کے منیجر چند نادر الوجود حیلے بہانے گڑھ کر شکست کے داغ مٹانے اور عوام کو مطمئن کرنے کی بے سود کوشش کرتے ہیں۔

تہران کے ایک روزنامہ "کیہان" کے مطابق پاکستانی باکسروں نے "ایشیائی چیمپئن شپ' کے دوران جیتے ہوئے کانسی کے تمغے بھی پھینک دیئے۔ یہ انتہائی قابل اعتراض بات اور غیر اسپورٹنگ رویہ کا اظہار ہے۔ میرا خیال ہے کہ حقائق جمع کرنے کے بعد حکومت کو ان لوگوں کے خلاف کارروائی کرنی چاہیئے جو مورد الزام ہیں۔

یہ بات بے حد دلچسپ ہے کہ وہ "صاحب" جو اس پورے شو کو چلا رہے تھے پاکستانی ہیں۔ ایشین باکسنگ ایسوسی ایشن کے سیکرٹری جن کی ہدایات اور نگرانی میں ایران باکسنگ فیڈریشن نے اس چیمپئن شپ کے انتظامات کئے تھے۔ لہٰذا ایران میں جو واقعات پیش آئے اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں، کوئی دوسرا نہیں۔ دوئم ہمارے باکسروں کے طرز عمل کے سلسلے میں ہمارا ہی آدمی ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ صاحب پاکستان باکسنگ فیڈریشن کے سیکرٹری بھی ہیں۔

اگر پاکستانی باکسروں کے ساتھ کوئی ناانصافی کی گئی تو ہمارے یہ اعلیٰ عہدے دار وہاں کیا کرتے رہے۔ انہوں نے اس کے بارے میں کوئی بیان کیوں نہیں دیا؟ ان کی معنی خیز خاموشی کا آخر مقصد کیا تھا؟ پھر یہ رپورٹ بھی تھی کہ "تہران چیمپئن شپ" میں شریک ہونے والے تھائی لینڈ کے "پیشہ ور باکسر" تھے۔ جبکہ مقابلہ اُبھرتے ہوئے باکسروں کے درمیان تھا۔ ایشین باکسنگ ایسوسی ایشن کے سیکرٹری اس مسئلے پر مہر بہ لب کیوں رہے؟

یہاں یہ افواہیں گشت کر رہی ہیں کہ "ہمارے سیکرٹری" صاحب کی خاموشی ان کے حق میں کافی سود مند ثابت رہی۔ کیونکہ وہ دوبارہ پاکستان ایشیائی باکسنگ فیڈریشن کے سیکرٹری منتخب ہونا چاہتے تھے۔ یہ جبھی ممکن تھا جب ایشیائی ملکوں کے دوسرے عہدیدار ان سے خوش ہوتے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ خاموش رہ کر اپنی راہ کی ہر رکاوٹ کو دور کر دیا۔ اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے قومی وقار کو قربان کر دیا۔"

ہمارے یہاں یہ ہمیشہ سے ہوتا ہے کہ ہمارے باکسر اکھاڑے میں ہار گئے۔ مگر ہمارے عہدے دار میزوں پر الیکشن جیت گئے۔ ایشیائی باکسنگ فیڈریشن کے سیکرٹری بین الاقوامی باکسنگ باڈی کے نائب صدر بھی ہوتے ہیں۔

تہران چیمپئن شپ کے علاوہ پاکستان ایڈنبرگ (اسکاٹ لینڈ) اور بنکاک (تھائی لینڈ) کے گزشتہ دو بین الاقوامی مقابلوں میں ایک بھی طلائی تمغہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

فنڈ کی کمی کو مسلسل شکست کی وجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ گزشتہ دو سالوں سے باکسنگ باڈی کو تقریباً دو لاکھ روپے مل چکے ہیں۔ گذشتہ سالانہ سرکاری گرانٹ کے علاوہ وزارت تعلیم کی طرف سے ۵۰ ہزار کی امداد منظور کی گئی۔ اس کے بعد صدر نے بھی اس سال ۵۰ ہزار کی خطیر رقم کی منظوری دی۔ یہ رقم بھی سالانہ گرانٹ کے علاوہ دی گئی

پاکستانی باکسروں کی صلاحیتوں کو بھی مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کیونکہ سیلون اور ملائشیا جیسے چھوٹے ملک جب طلائی تمغے حاصل کر سکتے ہیں تو پاکستان کیوں نہیں حاصل کر سکتا؟

دراصل اس کی تمام تر ذمہ داری ان نام نہاد عہدیداروں پہ عائد ہوتی ہے جنہیں غیر ملکی سیاحت اور دوروں سے زیادہ دلچسپی رہتی ہے جس کا زیادہ وقت اپنے عہدوں کو برقرار رکھنے کے لئے توڑ جوڑ میں گزرتا ہے۔ پاکستان باکسنگ فیڈریشن کے سیکرٹری کبھی بھی باکسر نہیں رہے۔ مگر باکسنگ فیڈریشن کی قیادت ان کے ہاتھوں میں ہے جو باکسر نہیں۔ باکسنگ کی ٹیکنک سے نابلد قائد کی سرکردگی میں چلنے والی فیڈریشن اچھے اور بہتر نتائج نہیں دے سکتی۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ باکسنگ کے میدان میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو۔ اور اس کے فنڈ کا استعمال صحیح طریقے سے ہو تو ہمیں اس میں انقلاب آفریں تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔ باکسنگ باڈی میں ایسے افراد کو شامل کرنا ہوگا جو اس فن پر کماحقہٗ دسترس رکھتے ہوں اگر ہم ایسا نہ کر سکیں تو خالی خولی نیک خواہشات اور یکے بعد دیگرے ناکامی پر پردہ ڈالنے سے قومی توقعات کبھی پوری نہ ہوں گی۔!

۷۰ کروڑ انسانوں کی شمولیت کے بغیر دنیا کی نمائندگی کیسی؟ بقیہ صفحہ ۹ سے آگے

آزادیٔ کشمیر کی جدوجہد شروع کر دی، قائدِاعظم نے بھارتی حکومت کو صلاح مشورے سے مسئلہ کشمیر حل کرنے پر زور دیا۔ لیکن بھارت نے مشورہ دیا کہ دونوں حکومتیں اقوام متحدہ سے مشترکہ طور پر درخواست کریں کہ وہ جلد سے جلد کشمیر میں استصواب رائے کرائے ۱۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو خان لیاقت علی خان نے اقوام متحدہ سے، کشمیر سے بھارتی فوجوں کے اخراج، غیر جانبدار حکومت کے قیام، اقوام متحدہ کے نمائندوں کی نگرانی میں استصواب رائے کرانے کا مطالبہ کیا۔ لیکن بھارتی حکومت نے اس مطالبہ کے جواب میں کہا کہ "جنگ بند کرانے کے لئے بھارت کی افواج کشمیر میں رہنی چاہیئے شیخ عبداللہ کی حکومت غیر جانبدار حکومت ہے اور اقوام متحدہ کے نمائندوں کو استصواب رائے کے سلسلے میں صرف مشورہ دینے کے لئے آنا چاہیئے۔" اس کے بعد بھارت نے یہ مسئلہ سلامتی کونسل میں پیش کیا اور الزام لگایا کہ "پاکستان نے کشمیر میں جارحانہ اقدام کیا ہے۔ جس سے بین الاقوامی امن خطرے میں پڑ گیا ہے" اقوام متحدہ کی مداخلت سے جنگ بند ہو گئی۔ بھارت نے استصواب رائے کرانے کا وعدہ کیا۔ لیکن ۲۴ سال گذرنے کے باوجود یہ وعدہ پورا نہیں کیا۔ اب بھارت کا یہ موقف ہے کہ بھارت میں کئی مرتبہ انتخابات ہو چکے ہیں۔ کشمیریوں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ اور اس طرح انہوں نے بھارت کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ اس لئے استصواب رائے کرانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارت نے پاکستان پر جو حملہ کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ چاہتا تھا۔ کہ اس فریق کو ہی ختم کر دیا جائے۔ جو کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی حمایت کرتا ہے۔ اس موقع پر بھی اقوام متحدہ۔ بھارت ہی کے کام آتا اور پاکستان کی مخالفت کے باوجود اس وقت جنگ بند کرائی جب پاکستان فتح حاصل کر رہا تھا اور بھارتی افواج شکست کھا کر بھاگ رہی تھیں۔

۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو اعلان تاشقند ہوا۔ اس معاہدے کو اقوام متحدہ اور اس کے سیکرٹری جنرل اوتھان نے بہت سراہا، کہ اب مسئلہ حل ہو جائے گا۔ لیکن وزیر اعظم بھارت نے کشمیر کے تنازعہ پر گفت و شنید کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ پہلے تو سال دو سال میں مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل میں پیش کر دیا جاتا تھا۔ مباحثوں اور قرار دادوں کا سلسلہ ہوتا رہتا تھا۔ لیکن اعلان تاشقند کے بعد یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

کشمیری عوام اب اقوام متحدہ سے مایوس ہو چکے ہیں اور انہیں یقین ہو گیا ہے کہ جب تک وہ ہتھیار نہیں اٹھائیں گے۔ اس وقت تک وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہیں گے۔

عوامی جمہوریہ چین کی رکنیت کا مسئلہ

عوامی جمہوریہ چین کی نمائندگی کا مسئلہ گذشتہ ۲۰ سال سے اقوام متحدہ میں زیر غور ہے۔ فیصلہ اس لئے نہیں ہو سکا کہ اقوام متحدہ کے آقائے ولی نعمت امریکی سامراج، عوامی جمہوریہ چین کو ناجائز اور غیر جمہوری حکومت سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں صرف فارموسا ہی پورا چین ہے اور نمائندگی کا حق صرف چیانگ کائی شیک کو ہی حاصل ہے۔ اب جب امریکی سامراج چین کے بڑھتے ہوئے اثرات اور ترقی کو روکنے میں ناکام ہو گیا ہے۔ اور خود انکل سام کا راج سنگھاسن ڈول رہا ہے۔ تو وہ چین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہو رہا ہے۔ صدر نکسن بھی سوشلسٹ چین کو اقوام متحدہ کا رکن بنانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن وہ فارموسا کی بھی رکنیت برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ چین نے صاف اور واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ "فارموسا چین کا اٹوٹ انگ ہے، اور وہ اس کی موجودگی میں اقوام متحدہ کی رکنیت قبول نہیں کرے گا۔"

اقوام متحدہ نے عوامی جمہوریہ چین کو اس کے حق سے محروم کر کے خود اپنے کو بین الاقوامی ادارے کی حیثیت دینے سے انکار کر دیا ہے جب دنیا کے ستر کروڑ افراد اس ادارے کے رکن نہیں ہیں تو اسے کس طرح بین الاقوامی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ جنرل اسمبلی کے آئندہ ہونے والے اجلاس میں عوامی جمہوریہ چین کی رکنیت کا سوال اٹھایا جائے گا۔ لیکن اس مرتبہ بھی اس کے رکن بننے کے امکانات بہت کم ہیں رکن بننے کے لئے جنرل اسمبلی کے ۲/۳ ووٹوں کی ضرورت ہو گی۔ امریکہ اور اس کے حاشیہ بردار ممالک فارموسا کی رکنیت برقرار رکھنے پر زور دیں گے، اور یہ بات یقیناً چین کو قابل قبول نہیں ہو گی۔

فلسطین

مسئلہ فلسطین اپریل ۱۹۴۷ء میں پہلی مرتبہ جنرل اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ عراقی نمائندے نے بڑی دل پذیر تقریر کی اور بتایا کہ کس طرح برطانیہ نے ۵ لاکھ غیر ملکی یہودیوں کو فلسطین میں آباد کر کے معاہدے کی دفعہ نمبر ۲۲ کے چوتھے پیراگراف کی سراسر اور اعلانیہ خلاف ورزی کی ہے لیکن اقوام متحدہ کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ لاکھوں فلسطینی عوام کو ان کے آبائی وطن سے بدخل اور انہیں مہاجر کیمپوں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کر کے اسرائیل کو ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو قیام کیا گیا۔ اقوام متحدہ نے ان فلسطینی عوام کی تو کوئی خبر نہ لی جو حیوانوں جیسی زندگی بسر کر رہے تھے۔ البتہ اسرائیل کو ۱۱ مئی ۱۹۴۹ء کو اپنا رکن بنا لیا۔ اس طرح اس بین الاقوامی ادارے نے ہزاروں اور لاکھوں لاشوں پر سامراجی طاقتوں کی ناجائز اولاد کو تحفظ فراہم کیا

۱۹۵۶ء میں اسرائیل، برطانیہ اور فرانس نے عرب ممالک پر حملہ کر دیا۔ روس کی دھمکی کی وجہ سے جنگ بند ہو گئی۔ اقوام متحدہ نے جنگ میں قبضہ کئے ہوئے علاقوں سے اسرائیلی فوج کے واپس چلے جانے کی قرار داد منظور کی لیکن اسرائیل نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اقوام متحدہ نے اپنی امن فوج صحرائے سینا میں مقرر کر دی جون ۱۹۶۷ء میں پھر اسرائیل اور عرب ممالک کے درمیان جنگ ہوئی۔ سیکرٹری جنرل اوتھان نے پراسرار اور نہایت خاموشی سے کسی صلاح مشورے کے بغیر جنگ سے پہلے ہی امن فوج واپس بلا لی جنگ شروع ہوئی تو سوویت یونین کی اپیل پر سلامتی کونسل کا اجلاس بلوایا گیا۔ اور جنگ بندی کی قرار داد منظور

کرتے ہوئے کہا گیا۔

● حالیہ جنگ میں قبضہ کئے ہوئے علاقوں سے اسرائیلی فوج واپس چلی جائے۔

● حالت جنگ کا خاتمہ کیا جائے اور دوسرے ممالک کے اقتدار اعلیٰ، سرحد اور سیاسی آزادی کا احترام کیا جائے۔

● تمام ممالک کو محفوظ اور تسلیم شدہ سرحدوں میں زندہ رہنے اور طاقت کے استعمال سے محفوظ رہنے کے حق کو تسلیم کیا جائے۔

● بین الاقوامی آبی شاہراہوں میں جہازرانی کی آزادی کو تسلیم کیا جائے۔

● سیکرٹری جنرل ایک نمائندے کو نامزد کرے جو متعلقہ ممالک کے درمیان رابطہ قائم کرکے امن کے قیام میں مدد کرے۔

اسرائیل نے اس قرارداد کو فوراً مسترد کر دیا۔ اوتھانٹ نے ڈاکٹر یارنگ کو اپنا نمائندہ مقرر کیا لیکن بات آگے نہ بڑھی۔ اسرائیل کو جارحانہ حرکت پر کوئی سزا نہیں دی گئی تھی۔ چنانچہ وہ شیر ہو گیا۔ اور اردن پر متعدد حملے کئے۔ مسئلہ کو سلامتی کونسل میں پیش کیا گیا۔ تو اسرائیل نے یہ بہانہ تراشا کہ "الفتح کے گوریلے اردنی علاقے سے اسرائیل میں آتے ہیں اور ہمارے مراکز تباہ کرتے ہیں" سلامتی کونسل میں اسرائیل کے خلاف قرارداد مذمت پیش کی گئی۔ لیکن امریکہ کی مخالفت کی وجہ سے جو قرارداد منظور ہوئی وہ اتنی غیر واضح تھی کہ ظالم اور مظلوم کا فرق مٹ گیا تھا۔ حالانکہ فرانس کے نمائندے نے بڑی معقول بات کہی کہ "ایک منظم حکومت کے سوچے، سمجھے اور منصوبے کے تحت تیار کئے ہوئے حملے میں اور ان لوگوں کی سرگرمیوں میں بڑا فرق ہے۔ جو آزادی کے جذبے سے سرشار ہیں۔ عرب گوریلے آزادی کے لئے جد وجہد کر رہے ہیں۔ اس لئے ان کی سرگرمیاں تحریک حریت کا ایک حصہ ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسرائیل کا حملہ ایک منظم حکومت کا باقاعدہ حملہ ہے۔ جو عالمی ادارے کے احکام کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ لہٰذا دونوں میں فرق نمایاں ہے"۔

اس قرارداد پر روس کے نمائندے کا رد عمل یہ تھا: "افسوس ہے ظالم اور مظلوم کو ایک ہی سطح پر رکھا گیا ہے"۔

اسرائیل نے جو اقوام متحدہ کی حقیقت سے بخوبی واقف ہے، اس قرارداد کو بھی فوری طور پر رد کر دیا۔ اور اعلان کیا کہ "اگر عرب گوریلوں کے حملے جاری رہے تو وہ اردن پر چڑھائی کا حق محفوظ رکھتا ہے"۔ یہ بیان اعلان جنگ اور ان تمام بین الاقوامی قوانین کو ٹھکرا دیتا ہے جن پر اقوام متحدہ کی بنیاد ہے۔

روجرز پلان کے تحت اگرچہ مشرق وسطیٰ میں اس وقت جنگ بند ہے۔ لیکن جنگ کے ہولناک شعلے کسی وقت بھی بھڑک سکتے ہیں۔ جنگ بندی کی مدت میں اضافہ کرکے کسی تنازعہ کو حل نہیں کیا جا سکتا۔ مشرق وسطیٰ کا واحد حل یہ ہے کہ ظالم اور مظلوم میں فرق کیا جائے۔ مظلوم کا حق دلوایا جائے

اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق تخفیف اسلحہ اور ایٹمی دوڑ کی روک تھام بھی اس کی ذمہ داری ہے لیکن امریکی سامراج کا دم چھلا ہونے کی وجہ سے وہ اس مقصد میں قطعی ناکام رہی ہے۔ ۱۹۶۲ء میں جنیوا میں ۱۸ ممالک پر مشتمل تخفیف اسلحہ کی ایک کمیٹی نے تخفیف اسلحہ کے بارے میں غور و خوض کیا۔ اس اجلاس میں دو ایٹمی طاقتیں فرانس اور عوامی جمہوریہ چین نے شرکت نہیں کی۔ چین اقوام متحدہ کا رکن نہ ہونے کی وجہ سے شریک نہیں ہوا۔ یہ اجلاس اس لئے بھی ناکام رہا کہ اس کمیٹی میں جاپان جیسے عسکری قوت کے مالک ملک کو بھی شامل نہیں کیا گیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تخفیف اسلحہ کا مسئلہ "چند بڑوں" کی باہمی گفت و شنید سے حل نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ دنیا کے تمام ممالک کو اس میں شریک کیا جائے۔ عالمی امن کا مسئلہ کسی ایک یا چند ممالک کا نہیں پوری دنیا کا ہے۔

یہ تھے چند بڑے بڑے مسائل جو ابھی تک اقوام متحدہ کے سرد خانے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اقوام متحدہ کی سب سے بڑی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ "پانچ بڑوں" کو ویٹو پاور دے کر اس بین الاقوامی ادارے پر ان کی اجارہ داری قائم کر دی گئی ہے۔ اقوام متحدہ سامراجیوں کی لمیٹڈ کمپنی بن کر رہ گئی ہے۔ اقوام متحدہ نے تمام ممالک خود مختار اور آزادی کو محکومی میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ خود مختار اور آزاد ریاست خواہ بڑی ہو یا چھوٹی، دونوں کا درجہ مساوی ہوتا ہے۔ یہی اصول امریکی سینیٹ میں اختیار کیا گیا ہے۔ ہر امریکی ریاست کو سینیٹ میں مساوی نمائندگی حاصل ہے۔ نیواڈا جیسی چھوٹی ریاست جس کی آبادی نیویارک کی آبادی کا صرف ایک فیصد ہے۔ سینیٹ میں دو نمائندے منتخب کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اور نیویارک جس کی آبادی سو گنا زیادہ ہے وہ بھی دو نمائندے منتخب کرتا ہے۔ مساوی نمائندگی کا اصول اس لئے اپنایا گیا کہ بڑی ریاستوں کی بالادستی چھوٹی ریاستوں پر قائم نہ ہو جائے۔ اس اصول میں ریاستوں کے اقتدار اعلیٰ کا نظریہ کام کرتا ہے۔ کیونکہ تمام ریاستیں خود مختار ہیں اگر یہی اصول اقوام متحدہ میں اپنایا جاتا تو یہ عالمی ادارہ مؤثر ہو سکتا ہے۔

دنیا کی مظلوم اقوام اقوام متحدہ سے مایوس ہو چکی ہیں اب وہ اپنے مسائل اس ادارے کے ذریعے طے کرنے کے بجائے خود طے کر رہے ہیں۔ ویت نامی

"الفتح" اور آپ کی رائے

"الفتح" آپ کا اپنا پرچہ ہے اور ہم آپ کی رائے کو وقیع تر سمجھتے ہیں۔ اس پرچے کی افادیت میں ہم اور بھی اضافہ کر سکتے ہیں اگر آپ مشورہ دیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے طور پر جو کوششیں کرتے ہیں اس کے متعلق آپ کی رائے بھی جان لیں۔ ہمارے ہاں جو مستقل سلسلے شروع ہیں اس کے بارے میں ہم جاننا چاہتے ہیں کہ انہیں جاری رکھا جائے یا ختم کر دیا جائے اور اگر جاری رکھا جائے تو ان میں کس قسم کے اضافے کی ضرورت ہے۔ آپ کو کونسا سلسلہ سب سے زیادہ پسند ہے؟ آپ مندرجہ ذیل موضوعات کے بارے میں اپنی رائے الگ کسی پرچے پر لکھ کر بھجوا دیں۔

۱- ظاہری خبریں اندرونی کہانیاں
۲- سنو آواز آ رہی ہے
۳- پردہ چاک
۴- سرمایہ دار معاشرے کا دوسرا رُخ
۵- ضیاء سرحدی کی یادداشتیں
۶- ہنزہ سے چاٹگام
۷- ۲۲ خاندان
۸- روزنامہ غالب سے روزنامہ جنگ تک

عوام کی دلیرانہ جدوجہد، فلسطینی گوریلوں کے اسلحہ کی جھنکار، کمبوڈیا کے عوام کی توپوں کی گھن گرج، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ سے ابھرتے ہوئے انقلابی ترانے، عوامی جمہوریہ چین سے ابھرتا ہوا سرخ سورج اس بات کا ثبوت ہے کہ مظلوم کا حق نہ دبایا جائے تو وہ حق چھین لینے کی ہمت بھی رکھتا ہے حق اور صداقت کا کارواں کسی کے روکے سے نہیں رکتا وہ تو راہ میں بکھرے ہوئے خاروں کو یا تو اٹھا کر پھینک دیتا ہے یا پھر اسے اپنے پاؤں تلے روند ڈالتا ہے۔ دنیا کی مظلوم اقوام اپنے حقوق کے حصول کے لئے اپنا خون دے رہی ہیں۔ وہ اقوام متحدہ سے اپنا خون بہا مانگتی ہیں۔ کیونکہ بین الاقوامی ادارہ ہونے کی وجہ سے مظلوم اقوام کے حقوق کا تحفظ بھی اسی کے ذمے ہے۔ اور یہ جو خون بہہ رہا ہے۔ یہ سب سامراجیوں کی لمیٹڈ کمپنی اقوام متحدہ پر ہے

اقوام متحدہ کے اراکین

نام ممالک	تاریخ رکنیت	نام ممالک	تاریخ رکنیت
اپر وولٹا	۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء	اٹلی	۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء
ارجنٹینا	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء	اردن	۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء
اسپین	۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء	استوائی گنی	۱۲ نومبر ۱۹۶۸ء
آسٹریا	۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء	آسٹریلیا	یکم نومبر ۱۹۵۵ء
اسرائیل	۱۱ مئی ۱۹۴۹ء	افغانستان	۱۹ نومبر ۱۹۴۶ء
اکوے ڈور	۲۱ دسمبر ۱۹۴۵ء	البانیہ	۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء
الجزائر	۸ اکتوبر ۱۹۶۲ء	ال سلویڈور	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
انڈونیشیا	۲۸ ستمبر ۱۹۵۰ء	انڈیا	۳۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء
آئرلینڈ	۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء	آئس لینڈ	۱۹ نومبر ۱۹۴۶ء
آئیوری کوسٹ	۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء	ایران	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
بارباڈوس	۹ دسمبر ۱۹۶۶ء	بائیلورشیا	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
برازیل	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء	برطانیہ	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
برما	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء	بلجیم	۲۷ دسمبر ۱۹۴۵ء
بلغاریہ	۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء	بوٹسوانا	۱۷ اکتوبر ۱۹۶۶ء
بورنڈی	۱۸ ستمبر ۱۹۶۲ء	بولیویا	۱۴ نومبر ۱۹۴۵ء
پاکستان	۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء	پاناما	۱۳ نومبر ۱۹۴۷ء
پرتگال	۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء	پولینڈ	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
پیراگوئے	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء	پیرو	۳۱ اکتوبر ۱۹۴۵ء
ترکی	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء	تھائی لینڈ	۱۶ دسمبر ۱۹۴۶ء
ٹرینیڈاڈ ٹوباگو	۱۸ ستمبر ۱۹۶۲ء	ٹوگو	۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء
ٹیونیشیا	۱۲ نومبر ۱۹۵۶ء	جمائیکا	۱۸ ستمبر ۱۹۶۲ء
جمہوریہ وسطی افریقہ	۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء	جنوبی افریقہ	۷ نومبر ۱۹۴۵ء
چلی	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء	چیکوسلوواکیہ	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
چین (فارموسا)	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء	حبشہ	۱۳ نومبر ۱۹۴۵ء
ڈنمارک	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء	ڈومینکن ری پبلک	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
ڈاہومی	۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء	روانڈا	۱۸ ستمبر ۱۹۶۲ء
رومانیہ	۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء	ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
زامبیا	۱۱ دسمبر ۱۹۶۴ء	سائرالیون	۲۷ ستمبر ۱۹۶۱ء
سعودی عرب	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء	سمالیہ	۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء
سنگاپور	۲۱ ستمبر ۱۹۶۴ء	سوازی لینڈ	۲۴ ستمبر ۱۹۶۸ء

سوڈان	۱۲ نومبر ۱۹۵۶ء	سوویت یونین	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
سوئیڈن	۱۹ نومبر ۱۹۴۶ء	سیلون	۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء
سینی گال	۲۸ ستمبر ۱۹۶۰ء	شاد	۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء
شام	۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء	عراق	۲۱ دسمبر ۱۹۴۵ء
عوامی جمہوریہ جنوبی یمن	۱۴ دسمبر ۱۹۶۷ء	غانا	۸ مارچ ۱۹۵۷ء
فرانس	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء	فلپائن	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
فن لینڈ	۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء	قبرص	۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء
کانگو برازاویل	۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء	کانگو (ڈیموکریٹک ری پبلک)	۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء
کمبوڈیا	۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء	کینیڈا	۹ نومبر ۱۹۴۵ء
کوسٹاریکا	۲ نومبر ۱۹۴۵ء	کولمبیا	۵ نومبر ۱۹۴۵ء
کویت	۱۴ مئی ۱۹۶۳ء	کیمیرون	۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء
کینیا	۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء	کیوبا	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
گابون	۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء	گامبیا	۲۰ ستمبر ۱۹۶۵ء
گنی	۱۴ دسمبر ۱۹۵۸ء	گواٹی مالا	۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء
گی آنا	۲۰ ستمبر ۱۹۶۶ء	لائبیریا	۲ نومبر ۱۹۴۵ء
لاؤس	۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء	لبنان	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
لکسمبرگ	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء	لیبیا	۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء
لیسوتھو	۱۷ اکتوبر ۱۹۶۶ء	مالدیپ	۲۱ ستمبر ۱۹۶۵ء
مالی	۲۸ ستمبر ۱۹۶۰ء	متحدہ عرب جمہوریہ	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
متحدہ جمہوریہ تنزانیہ	۱۴ دسمبر ۱۹۶۱ء	مالاوی	یکم دسمبر ۱۹۶۴ء
مالٹا	یکم دسمبر ۱۹۶۴ء	مڈغاسکر	۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء
مراکش	۱۲ نومبر ۱۹۵۶ء	ملائیشیا	۱۷ ستمبر ۱۹۵۷ء
منگولیا	۲۷ اکتوبر ۱۹۶۱ء	موریطانیہ	۲۷ اکتوبر ۱۹۶۱ء
مورشش	۲۴ اپریل ۱۹۶۸ء	میکسیکو	۷ نومبر ۱۹۴۵ء
ناروے	۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء	نائیجر	۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء
نیپال	۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء	نکاراگوا	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
نیدرلینڈز	۱۰ دسمبر ۱۹۴۵ء	نیوزی لینڈ	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
وینی زوئیلا	۱۵ نومبر ۱۹۴۵ء	ہائیٹی	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
ہنگری	۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء	ہونڈوراس	۱۷ دسمبر ۱۹۴۵ء
یمن	۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء	یوراگوئے	۱۸ دسمبر ۱۹۴۵ء
یوکرین	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء	یوگنڈا	۲۵ اکتوبر ۱۹۶۲ء
یوگوسلاویہ	۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء	یونان	۲۵ اکتوبر ۱۹۴۵ء
جاپان	۱۸ دسمبر ۱۹۵۶ء	نائیجیریا	۷ اکتوبر ۱۹۶۰ء

محمود علی

پھولے نہیں سماتے ہیں

ایک شعر جو

نوابزادہ نصراللہ ــ نہ سُنا سکے

مختلف نمائندوں سے

پی ڈی پی کے نورالامین اور محمود علی اب کے کراچی آئے تو سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔ محمود علی ویسے مرنجان مرنج آدمی ہیں۔ مگر اب کے تو وہ پھولے نہیں سماتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں زندگی کی سب سے بڑی معراج حاصل ہوگئی۔ انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا کہ وہ اقوام متحدہ میں جانے والے پاکستانی وفد کے سربراہ بن جائیں گے۔ کراچی کے اخبار نویسوں نے انہیں گھیرا تو کہنے لگے ”کیا ہوا میں منتخب نہیں، محبّ وطن تو ہوں۔“ ظاہر ہے کہ پاکستان میں مُحبّ وطن ہونا بھی انفرادیت ہے۔ کیونکہ یہاں ایسے بہت کم لوگ پائے جاتے ہیں۔ محبّ وطن وہ ہے جسے پی ڈی پی اور دوسری جماعتیں محبّ وطن قرار دیں۔ یا جنہیں حکومت محبّ وطن ہونے کا سرٹیفکیٹ عنایت کر دے۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

محمود علی کے دوسرے ساتھی نصراللہ خان اور نورالامین جو چاہے کہتے رہیں۔ محمود علی ”سب ٹھیک ہے“ کا نعرہ بلند کر رہے ہیں۔ نصراللہ خان مشرقی پاکستان سے لوٹے تو انہوں نے کہا کہ ضمنی انتخابات نہیں ہو سکتے۔ ابھی سالخوردہ رہنما نورالامین آئے تو انھوں نے بھی یہ مژدہ سنایا کہ ضمنی انتخابات نہیں ہو سکتے۔ محمود علی کہتے ہیں سب ٹھیک ہے ہو سکتا ہے۔ ان سے ایک غیر رسمی ملاقات ہوئی۔ اس کا ماحصل یہ تھا۔

۱۔ مشرقی پاکستان کے تمام عوام کے ذہن صاف ہو گئے اور وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مجیب الرحمٰن اور ان کے ساتھی وطن دشمن تھے۔

۲۔ عوام یہ بھی سمجھ چکے ہیں کہ انتخابات سے پہلے ہم لوگ (پی ڈی پی)، جو کچھ کہتے تھے ٹھیک ہی کہتے تھے۔

۳۔ اقوام متحدہ میں جانے والے وفد کا کوئی جواب نہیں۔ ہم بھارت کا کیا تمام ممالک کے پراپیگنڈے کا جواب دے دیں گے۔

۴۔ اس سے پہلے میں نے جو غیر ملکی دورہ کیا تھا اس سے ۶۰ فیصدی سے زیادہ حالات تبدیل ہو گئے غیر ممالک میں رہنے والے بنگالیوں کے ذہن بدل گئے۔

۵۔ اس وفد کے ڈھانچے پر وہی لوگ تنقید کر رہے ہیں جنہیں اس وفد میں شامل نہیں کیا گیا۔

محمود علی صاحب کی آنکھوں میں سپارٹ پن ہے نورالامین کی آنکھوں میں تھکن ہے اور نوابزادہ نصراللہ خاں کی آنکھوں میں عیاری ہے۔ محمود علی یا نورالامین باتیں کرتے ہیں تو نصراللہ خاں فاتحانہ انداز سے ان دونوں پر نگاہِ حقارت ڈالتے ہیں اور اخبار نویسوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہیں۔

نورالامین صاحب ـ صدر سے ملاقات کے بعد تفصیلات بتا رہے تھے۔ تو انہوں نے درمیان میں بتایا کہ زیادہ سے زیادہ خودمختاری اور اقتصادی عدم توازن کو دور کرنے کے لئے میں نے اپنے آٹھ نکات کا مسودہ پیش کیا جو پی ڈی پی کے منشور میں بھی شامل ہے۔

نوابزادہ نصراللہ خاں نے لقمہ دیا یہ آٹھ نکات پی ڈی ایم کے ہیں۔

نورالامین نے کہا اس میں الجھنے کی ضرورت نہیں یہ نکات اب ہمارے منشور میں شامل ہیں۔

نوابزادہ نصراللہ پھر بولے اس میں دوسری پارٹیوں کا بھی حصہ ہے اس کا حوالہ دینا تو ضروری ہے۔

نورالامین نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے اخبار نویسوں سے کہا ”آپ اسے پی ڈی پی کے منشور میں شامل آٹھ نکات ہی کہیئے۔ کیونکہ ہم دوسری پارٹیوں کی طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔“

اس پر نوابزادہ نصراللہ کھسیانے سے ہو کر خاموش ہو گئے۔ اگر پریس کانفرنس نہ ہوتی تو وہ کوئی شعر سنا دیتے۔ مگر موقع نہ مل سکا۔ میں ان کے ہونٹوں پر ایک شعر کو آ کر واپس جاتے دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں



چینی استقبالیہ میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو، بیگم رعنا لیاقت علی اور چینی قونصل جنرل ماؤ چو جی

کھوڑو صاحب —— کسمپرسی کے عالم میں

ع پھرتا ہے میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

کی چلتی پھرتی تصویر ۱۵ ستمبر کو چینی قونصل جنرل کے عصرانے میں نظر آئی۔ مسٹر ایوب کھوڑو کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ادھر ادھر ڈولتے پھر رہے تھے۔ شاید کسی پرانے چہرے کی تلاش ہو گی یار لوگ کترا کر نکل رہے تھے۔ کھوڑو صاحب کو لفٹ نہیں مل رہی تھی یہ تو شمیم اللہ والا کو دعا دیجئے کہ انہوں نے کچھ لفٹ دے کران کے آنسو پوچھ لئے ع

یادش بخیر! ایک زمانہ تھا۔

مسٹر کھوڑو سندھ کے مرد آہن کہلاتے تھے وزیر اعلیٰ بنے تو یاران طریقت نے انہیں "ہٹلر ثانی" کا خطاب نوازا۔ قانون ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ اور حکومت کا خزانہ ان کی جیب۔ درباریوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ جہاں کہیں جاتے مصاحبوں کا غول کا غول ان کے ساتھ ہوتا۔ لیکن یہ ماضی کی باتیں ہیں ہم نے اس کا ذکر تو یوں کر دیا کہ کھوڑو صاحب کو بھی اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ ع

یادِ ماضی عذاب ہے یارو

اخباری زبان میں سی آئی ڈی والوں کو "فدویان" کہتے ہیں۔ چینی قونصل جنرل کے عصرانے میں بہت سے "فدویان" موجود تھے' ایک صاحب صحافی کا روپ دھارے ہوئے تھے۔ جب پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر بھٹو تشریف لائے۔ تو اخبار نویسوں نے انہیں گھیر لیا۔ سوالات شروع کر دیئے مسٹر بھٹو نے کہا کہ وہ عنقریب ایک پریس کانفرنس کریں گے۔ ان تمام سوالات کا جواب اسی پریس کانفرنس میں دیں گے۔ وہ اس تقریب میں سیاسی گفتگو کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ اخبار نویس نما "فدوی" نے پوچھا "آپ صدر یحییٰ سے کب ملاقات کر رہے ہیں؟" مسٹر بھٹو نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اور پوچھا "آپ کس اخبار کے نمائندے ہیں؟ یہ سوال کرنا تھا کہ وہ صحافی نما "فدوی" رفو چکر اور کراچی کی اصطلاح میں "کلٹی" ہو گیا۔

ہمارے خیال میں مخبری کا یہ طریقہ بہت پرانا اور فرسودہ ہو چکا ہے اب طریقہ بدل دینا چاہئے بلکہ ختم کر دینا چاہئے کیونکہ آج کل ایسے اسلام پسند اخبار نویسوں کی کمی نہیں جو اپنے اخبار میں رپورٹ دینے سے پہلے سی آئی ڈی والوں کو رپورٹ دیتے ہیں

یہ استقبالیہ عوامی جمہوریہ چین کے نئے قونصل جنرل مسٹر ماؤ چو جیی کی جانب سے دیا گیا تھا جس میں گورنر سندھ مسٹر رحمان گل مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سابق گورنر مغربی پاکستان محمد موسیٰ، بیگم رعنا لیاقت علی، سندھ کے چیف سیکرٹری شیخ منظور الٰہی مسٹر کنور ادریس، مسٹر غلام فاروق اور مسٹر محمد امین کھوسو نے شرکت کی۔

اس ہفتہ کی اہم خبریں

صدر کے اقتصادی مشیر پر قاتلانہ حملہ

راولپنڈی ۱۵ ستمبر: صدر کے اقتصادی مشیر مسٹر ایم ایم احمد پر آج صبح ایک شخص نے قاتلانہ حملہ کیا۔ جس سے وہ زخمی ہو گئے۔ انہیں کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں ان کی حالت اطمینان بخش بتائی جاتی ہے۔

پاکستانی روپے کا تعلق ڈالر سے کر دیا گیا

کراچی ۱۶ ستمبر: پاکستان کی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ کل سے پاکستانی روپے کا پونڈ اسٹرلنگ سے تعلق ختم کر دیا جائے گا۔ اور کل ہی سے پاکستانی روپے کا تعلق ڈالر سے قائم کیا جائے گا۔ یہ قدم موجودہ بین الاقوامی کرنسی کی صورت حال کے پیش نظر اٹھایا گیا۔ تاکہ بین الاقوامی منڈیوں میں پاکستانی برآمدات کی سابقہ پوزیشن برقرار رکھی جائے۔

مشرقی پاکستان کی نئی صوبائی کابینہ

ڈھاکہ ۱۷ ستمبر: مشرقی پاکستان کی وزارتی کونسل کے دس میں سے نو ارکان نے آج یہاں حلف اٹھا لیا۔ صوبائی کابینہ میں کونسل مسلم لیگ، کنونشن مسلم لیگ، جماعت اسلامی اور کالعدم عوامی لیگ کے دو ارکین شامل کئے گئے ہیں۔

اسمبلی کو آئین پر بحث کرنے کیلئے ۹۰ دن دیئے جائیں گے

اسلام آباد: ۱۸ ستمبر: صدر یحییٰ نے ایک نشری تقریر میں اعلان کیا ہے۔ کہ نیا آئین جو مرتب کیا جا رہا ہے۔ اسے تعبیری ترمیم یا اصلاح کے لئے قومی اسمبلی میں پیش کیا جائے گا۔ قومی اسمبلی میں آئین پر بحث اور تجاویز پیش کرنے کے لئے ۹۰ دن کی مہلت دی جائے گی، ۹۰ دن کے بعد آئین عبوری نہیں رہے گا۔ اسے آخری شکل دے دی جائے گی۔

مشرقی پاکستان میں ضمنی انتخابات کے پروگرام کا اعلان کر دیا گیا

اسلام آباد ۱۹ ستمبر: الیکشن کمیشن نے آج مشرقی پاکستان میں قومی اسمبلی کی ۷۸ نشستوں اور صوبائی اسمبلی کی ۱۰۵ خالی نشستوں پر ضمنی انتخابات کے لئے پروگرام کا اعلان کر دیا۔ کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی آخری تاریخ ۳۰ ستمبر ۱۹۷۱ء رکھی گئی۔ مشرقی پاکستان کے مختلف حلقوں میں پولنگ ۲۵ نومبر سے ۹ دسمبر تک ہو گی۔

اسٹیٹ بنک کے سونے اور زرمبادلہ کے ذخائر میں کمی

پشاور ۱۹ ستمبر: اسٹیٹ بنک کی سالانہ رپورٹ میں بتایا گیا کہ گذشتہ سال کے دوران زرعی پیداوار میں ۳ء۲ فیصد کمی ہو گئی۔ جبکہ صنعتی پیداوار میں صرف ۴ء۲ فیصد کا اضافہ ہوا۔ ۷۱-۱۹۷۰ء کے دوران مہنگائی بدستور رہی۔ اور سال کے بیشتر حصے میں گندم اور چاول کی قیمتیں گراں رہیں، زیر نظر سال کے دوران پاکستان کے توازن ادائیگی میں مجموعی طور پر ۴۳ کروڑ ۲۵ لاکھ روپے کا خسارہ ہوا، جبکہ اس سے پہلے سال میں یہ خسارہ صرف ۳ کروڑ ۳۲ لاکھ روپے تھا۔ زیر نظر سال کے دوران اسٹیٹ بنک کے پاس سونے اور زرمبادلہ کے ذخائر میں ۵۲ کروڑ ۸۹ لاکھ روپے کی کمی ہوئی۔ گذشتہ سال کے مقابلے میں درآمدات ۱۵ کروڑ ۷۸ لاکھ روپے کا اضافہ ہوا۔ جب کہ برآمدات میں ۳ء۲ فیصد اضافہ ہوا، زیر نظر سال کے دوران پاکستان کو کنسورشیم اور دوسرے ملکوں نے مجموعی طور پر ۵۳ کروڑ ۹۰ لاکھ ڈالر کی امداد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن مارچ ۱۹۷۱ء تک پاکستان صرف ۲۹ کروڑ ۴۸ لاکھ ڈالر کی رقم ملی۔

قارئین کہتے ہیں



فلم "امن" کیوں مسترد کردی گئی

پاکستان فلم سنسر بورڈ کے ہاتھوں ہماری فلمی صنعت جن مشکلات اور دشواریوں میں گھری ہوئی ہے وہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے اس پر جتنا غور کیا جائے اور لکھا جائے کم ہے۔ اس سے کہیں زیادہ سنگین مسئلہ ہمارے سامنے ہے۔ ہماری اس صنعت کے بعض قابل اور ممتاز فلم ساز و ہدایت کار خصوصیت کے ساتھ سنسر بورڈ کے ہدف بنے ہوئے ہیں ان کا قصور بس اتنا ہے کہ وہ سوشلسٹ نظریات رکھتے ہیں۔ اور اپنی فلم کی تکمیل میں عوامی مسائل اور قومی مزاج کو زیادہ جگہ دیتے ہیں۔ اول تو ان کی فلمیں مہینوں سنسر بورڈ کے سامنے پیش نہیں کی جاتیں۔ جب پیشی کی باری آتی ہے تو فلم کے ہر پہلو پر غور و فکر میں ہفتوں گزر جاتے ہیں بلاوجہ اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں قطع برید کی جاتی ہے قینچی چلا چلا کر فلم کا "تسلسل" اور "بیکوتس" کا بیڑا غرق کر دیا جاتا ہے اور اس کے بعد ہزار احسان جتاتے ہوئے فلم کی نمائش کا سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے کٹی پھٹی فلم عوامی مزاج پر پورا نہیں اترتی۔ نتیجتاً فلم فلاپ ہو جاتی ہے اور فلم ساز و ہدایت کار کا دیوالیہ نکل جاتا ہے۔

ریاض شاہد ہماری فلمی صنعت کے ممتاز اور مقبول ہدایت کار ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کئی کامیاب فلموں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی فلمیں "زرقا" اور "غرناطہ" سنسر بورڈ کی بے رحم قینچی کی زد سے گزرنے کے باوجود عوام میں مقبولیت کا ریکارڈ قائم کر چکی ہیں۔ سنسر بورڈ والوں کو اگر پتہ ہوتا کہ ان کی خصوصی توجہ کے باوجود فلمیں کامیاب ہوں گی تو شاید وہ ان فلموں کو پاس نہیں کرتے اس بار ریاض شاہد کی تازہ ترین فلم امن سنسر کے سامنے پیش ہونے کو آئی تو احتیاطاً اس بار قطع برید اور بلاوجہ اعتراضات پر وقت برباد نہیں کیا گیا بلکہ پوری فلم کو قابل اعتراض قرار دے کر روک لیا گیا ریاض شاہد سنسر والوں کے خلاف آواز بلند کر چکے ہیں مگر ابھی تک کوئی شنوائی نہیں ہوئی اس فلم کا موضوع کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی پر مبنی ہے۔ ممکن ہے فلم میں کشمیر کے مظلوم عوام کو بھارتی توسیع پسندوں اور ڈوگرہ راج کے خلاف مسلح جدوجہد کرتے ہوئے دیکھا گیا ہو۔ اگر ایسا ہے تو بلا خوف و تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ فلم کی یہ بات سنسر بورڈ والوں پر گراں گزری ہو گی۔ بھلا وہ کشمیری عوام کو اپنی آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کرتے ہوئے کس طرح سے دیکھ سکتے ہیں؟

سنسر بورڈ اس بات کی وضاحت کرے کہ اس نے ریاض شاہد کی فلم "امن" کو کس بنا پر نمائش کے لائق نہیں سمجھا۔ اور اگر فلم نمائش کے قابل ہے تو ابھی تک نمائش کی اجازت کیوں نہیں دی گئی ۔؟ (ارشاد علی کراچی)

قارون و ہامان کے خاندانوں کا سلسلہ جاری رکھئے

دفاع کا نمبر اتنا خوبصورت اور معیاری پرچہ دیکھ کر از حد مسرت ہوئی۔ آپ نے اتنا مختصر مگر جامع نمبر نکالا کہ مغربی مقامروں کے نمک خواروں کے بھاری بھرکم پرچے اس کے سامنے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ آپ کی کاوش کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔

حالیہ شمارے میں قارون و ہامان کے ۲۲ یا ۳۳ خانوادوں میں سے "سہگل" پر جامع مضمون معلومات افزا ہے۔ آپ ان کی برادری کے دوسرے لوگوں کو بھی اسی طرح متعارف کراتے رہیں تو آپ کا احسان ہو گا۔

اگر گستاخی نہ ہو تو عرض کروں کہ سہگلوں کے اثاثے میں دو موجودہ اور ایک مستقبل کے اداروں کا ذکر نہیں آیا ہے۔ غالباً ان تین کو انہوں نے کراچی اسٹاک ایکسچینج میں کسی خاص مصلحت کے تحت رجسٹرڈ نہیں کرایا ہے۔ ان کا حدود اربعہ ملاحظہ کیجئے

۱۔ یونین بنک لمیٹڈ ۲۔ (۲) رچنا ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ گلیانہ (گوجر خاں)، راولپنڈی اور مستقبل قریب کا سکھو (گوجر خاں) میں قائم ہونے والا ہے ویجی ٹیبل گھی کا کارخانہ۔

(اکرم سرحدی اسلام آباد)

خوب سے خوب تر

جون کے بعد الفتح کی "زیارت" سے محروم رہا۔ گذشتہ دو ہفتہ سے برابر الفتح آئیڈیل بک سنٹر والوں کے پاس آ رہا ہے۔ یعنی دو ہفتہ سے آپ حضرات سے نصف ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ آپ لوگ الفتح کو جس جانفشانی سے نکال رہے ہیں وہ صحافت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کے ساتھ ساتھ عوام میں صحیح سیاسی شعور بھی بیدار کر رہے ہیں۔

۲ ستمبر کے شمارے میں سنو آواز آ رہی ہے خوب سے خوب تر ہے۔ (منور فیضی - چٹاگانگ)

اسلام پسند عوام سے دُور ہیں

آپ کا رسالہ الفتح پڑھتا ہوں۔ سالنامہ بہت پسند آیا۔ آپ نے جو نام نہاد اسلام پسندوں، مسلم لیگیوں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی جو باتیں ظاہر کی ہیں انہیں پڑھ کر بہت خوشی حاصل ہوتی ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ آپ ہر ہفتے ایسے ہی مضامین شائع کرتے رہیں گے۔

میں پاکستان پیپلز پارٹی حیدر آباد کا سرگرم کارکن ہوں۔ میری طرف سے ذوالفقار علی بھٹو کو ان کی صحت یابی اور دوبارہ عملی سیاست میں اسی سرگرمی سے حصہ لینے پر مبارکباد دیں۔ بھٹو صاحب کی میں بہت قدر کرتا ہوں۔ کیونکہ انہوں نے سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ اور ایوبی آمریت کو ٹھکانے لگا دیا۔ ہمارے نام نہاد اسلام پسند لیڈر اس وقت بھی عوام سے دور تھے اور آج بھی ان سے دور ہیں۔ اگر وہ عوام کی قیادت کا دعویٰ کرتے ہیں تو انہیں عوام میں رہنا چاہیئے تھا۔ (شفیق احمد خاں سومرو۔ حیدر آباد)

بقیہ : ظاہری خبریں اندرونی کہانیاں

سیاسی آزمائش کے سب سے بڑے موڑ پر کھڑی ہے اور اسے بھوک اور غربت سے بلکتے کروڑوں کو جواب دینا ہے ۲۳ ستمبر سے اسکی سنٹرل کمیٹی کا اجلاس کوئٹہ میں ہو رہا ہے یہ اجلاس کیا فیصلے کرتا ہے یہ یقیناً اہم فیصلے ہوں گے۔ کیونکہ صدر صاحب کی ۲۸ جون والی تقریر سے لے کر اب تک حکومت کے تمام بیانات اور پالیسیوں کے بارے میں بھٹو صاحب نے اپنے ردعمل کا اظہار نہیں کیا ہے۔ وہ اس اجلاس کا انتظار کر رہے ہیں۔ کوئٹہ میں اس اجلاس کے انعقاد سے بلوچستان کی سیاست پر بھی کافی اثر پڑے گا — اور کچھ منتخب ارکان صوبائی اسمبلی پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کریں گے۔

سنٹرل کمیٹی کا یہ اجلاس نہایت اہم ہے، لیکن عوام اور موجودہ مسائل کا تقاضا ہے کہ کمیٹی کی میٹنگوں اور صدر سے ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ، باہر کے محاذ پر بھی جدوجہد جاری رہنی چاہئے کیونکہ وہ بھٹو تاریخی اور انقلابی بھٹو ہوتا ہے جو عوام کے سامنے آجانے سے شعلے کی طرح بھڑکتا ہے۔

بقیہ : احوال واقعی

غیر ملکی امداد بند ہونے کے سبب التواء کا شکار رہے بہت سی صنعتیں اس لئے دم توڑ رہی ہیں۔ امداد دینے والی غیر ملکی طاقتیں ہمیں ناک چنے چبوانے کے درپے ہیں، امداد دیتی ہیں یا قرضے تو ساتھ یہ شرط بھی عائد کر دیتی ہیں کہ یہ امداد ان کی مرضی کے مخصوص منصوبوں میں استعمال ہونی چاہیئے اس کے ساتھ ساتھ سامراجی ایجنٹ ملک میں ایسی سازشیں کرتے رہتے ہیں کہ اقتدار عوام کو نہ ملنے پائے، فوج کو حرکت میں رہنا پڑے فوج کی نقل و حرکت جاری رہے گی، اخراجات زیادہ ہوں گے، قوم پر بوجھ پڑے گا دفاع کے لئے بجٹ میں رقم بڑھتی رہے گی۔ یہ رقم اسلحہ خریدنے پر صرف ہوگی، یہ اسلحہ انہی بڑی طاقتوں سے خریدا جا سکتا ہے، جو ہمارے ہاں سازشوں کی سرپرستی کرتی ہیں۔ پی آئی اے کو اپنا جو راستہ تبدیل کرنا پڑا ہے اس سے ہر پرواز میں پی آئی اے کو تقریباً ۲۵ ہزار روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔ پی آئی اے کو یہ رقم دفاعی بجٹ میں سے فراہم کی جا رہی ہے، اس کے علاوہ مشرقی پاکستان میں گذشتہ واقعات کی وجہ سے صنعتی پیداوار اب نہ ہونے کے برابر ہے، اس سے برآمدات میں بہت فرق پڑا ہے یہ سارا بوجھ اس وقت مغربی پاکستان کے عام افراد کو برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ فی الحال تو عوام اسے ملک کی سلامتی اور اتحاد کے نام پر خوشدلی سے برداشت کر رہے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے ماہرین اور ذمہ دار حضرات ایسی کوئی منصوبہ بندی نہیں کر رہے ہیں جس سے ان افراد پر پڑنے والے بوجھ میں کمی ہو سکے۔ اس کا انجام کیا ہوگا، غریب آدمی کب تک یہ بوجھ اٹھائیں گے،

ملک کی موجودہ اقتصادی حالت اور خود درانی صاحب کے اعترافات اب چیخ چیخ کر اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ موجودہ نظام نے پاکستان کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے پاکستان کی اکثریت کی کمر توڑ دی ہے اس لئے منصوبہ بندی کے ماہرین، بیوروکریسی اور دوسری طاقتوں کو خبردار ہو جانا چاہیئے کہ وہ اس گھسے پٹے نظام کو سہارا دینے کی بجائے ایسا اقتصادی نظام اختیار کریں، جو اس ملک کے اقتصادی مسائل کو حل کر سکے، قدرتی وسائل کا ساتھ دے سکے۔ قدرتی وسائل میں بارہ کروڑ افراد کے دست و بازو بھی شامل ہیں۔ اور وہ نظام۔ سوشلسٹ اقتصادی نظام کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ ابھی تو اقتصادی کھوکھلے پن کا اعتراف صرف درانی صاحب یعنی سٹیٹ بنک کے گورنر نے کیا ہے۔ رفتہ رفتہ دوسرے مالیاتی شعبوں کے سربراہ بھی یہ اعتراف کریں گے تاریخ کے دھارے کو روکنا ماہرین کے بس کی بات نہیں ہے

بقیہ :۔ سنو! آواز آرہی ہے

تھے۔ وہ جب ان کے سامنے آئے۔ انہوں نے ان کو رد کر دیا۔ اور ایک بار پھر سامع نے ان کی چیخ سنی۔

"سوادِ اعظم نے پھر غلط فیصلہ دیا ہے۔"

سامع نے دیکھا کہ یہ چہرے، وطن کے ٹکڑے کرنے کے درپے علیحدگی پسندوں کے جلو میں جا بیٹھے اور سامع نے ان کا نعرہ بھی سنا:

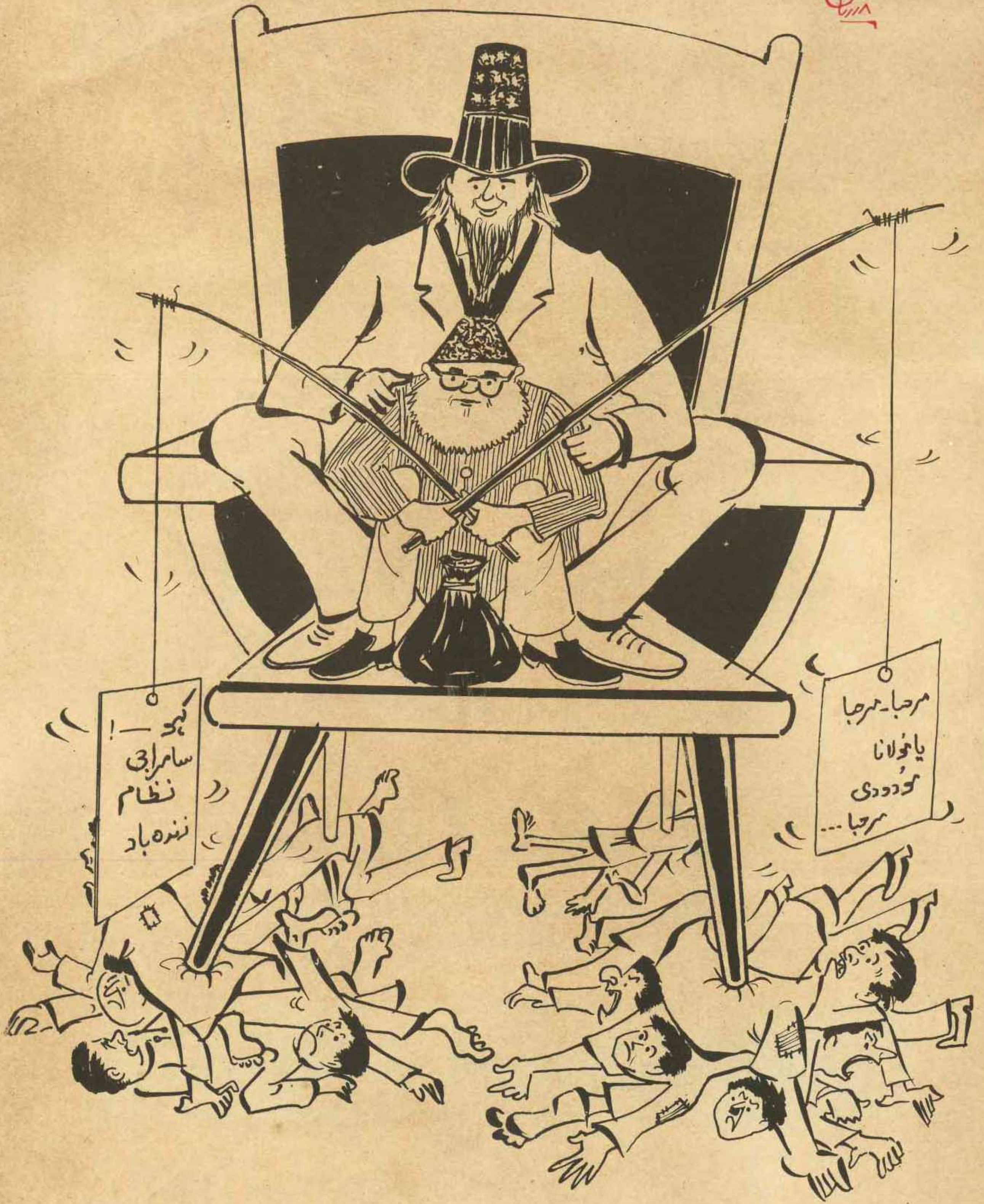
"اقتدار فوراً ان کے حوالے کر دو۔"

لیکن سوادِ اعظم انہیں خوب پہچانتے تھے۔ سوادِ اعظم کے جیالے بیٹے، اور وطن کے ولاور محافظ۔ علیحدگی پسندوں کے منصوبوں میں آڑے آگئے اور یہ چہرے بے پھر بے نقاب ہو گئے۔

اور اب ان چہروں کا غازہ جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو انہوں نے ملا تھا پوری طرح اتر چکا ہے۔

ان کے الفاظ ان کی گفتگو سے ان کا بھیانک ماضی پھوٹ پڑتا ہے۔

سوچتے ہیں آج شرحِ سوزِ پنہاں کیا کریں
داغ ہائے دل کو اشکوں میں نمایاں کیا کریں



مشرقی پاکستان کی غیر نمائندہ اور غیر سیاسی کابینہ میں جماعت اسلامی کو بھی دو وزارتیں مل گئی ہیں

(ایک خبر)

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi

23-30, SEPTEMBER, 1971

حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد کراچی